

ایک قرآن

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ
مہتمم دارالمسلمین دہلی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ادارۃ اسلامیات ○ لاہور

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان
۴	تعریف منظوم از حضرت مولانا حافظ محمد اویس صاحب کاندھلوی
۵	مقدمہ
۱۱	تسمیہ
۱۶	جزئیات کا سنہ وقوع کلیات کے تابع ہے
۴۵	مادی طاقتوں پر عبور و سر کرنے کی بنیادی علت
۶۸	قرآن کا مقصد و حیدر مکمل خلافت ہے
۶۹	معیار خلافت و استغلات
۷۰	کمالیت خداوندی کی تین نوعیں
۷۴	کمالیت سرگاز کی نوعیت
۱۲۶	خاتم کتب

۲

پہلی بار کسی طباعت	۱۹۶۶ء
باہتمام	اشرف برادران سہم الزمین
ناشر	ادارۃ اسلامیات - لاہور
طباعت	
کتابت	مشائق احمد جلالپوری
قیمت	

ملنے کے پتے یہ

ادارۃ اسلامیات ۱۹۰-انارکلی لاہور نمبر ۲
 دکن الاشاعت آرڈو بازار - کراچی نمبر ۱
 ادارۃ المعارف دکن ملنے دارالعلوم کراچی نمبر ۱
 مکتبہ دارالعلوم، ڈاکٹر ذوالعلوم، کراچی نمبر ۱

تقریظ منظوم

بر تحریر دل پذیر حضرت ہبتم صاحب دارالعلوم دیوبند

از حضرت مولانا حافظ محمد ادریس صاحب کاندھلوی

شاد باش اسے خستہ بیمارِ نظر
کے برایت می رسد کل البصر
ایں حقائقِ ایں معارف را بہیں
ایں چنین بیند نگاہِ دورِ بین
ریختہ از کلبِ آں روشن ضمیر
کہ ندارد از حقائق او نظیر
”طیب“ ابنِ قاسم است آن ارجمند
ناظمِ دارِ العلوم دیوبند
ہست قرآن یک ولیکن احوال
از حوالِ بیند آں را دو قرآن
ہچنین اسلام یک لے خوش سیر
لیک دو اسلام گوید بد نظر

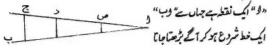
احوالِ چوں دفع شد یکساں شوند

آں دوسہ گویاں یکے گویاں شوند



مقدمہ

زاویہ نظر (ANGLE OF FRISON) کا انحدوت معمول نتائج نہیں پیدا کرتا بلکہ فاش اہم غلطیوں کا موجب ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً ایک زاویہ کے دو خطوط ایک ہی نقطہ سے شروع ہوتے ہیں، لیکن جوں جوں اُن کے بڑھتے جاتے ہیں دونوں خطوط کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ خواہ زاویہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ حسب ذیل شکل ملاحظہ فرمائیے:-



”و“ ایک نقطہ ہے جہاں سے ”ب“ و ”ج“ ایک خط شروع ہو کر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اب جتنے خطوط ”و“ سے شروع ہو کر ”ب“ تک پہنچنا چاہیں گے انہیں لامحالہ ”ب“ کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ لیکن ”و“ کوئی خط شروع ہوتا ہے ”و“ ہی سے اور پہنچنا بھی چاہتا ہے ”ب“ تک مگر ”ب“ کا راستہ اختیار نہیں کرتا بلکہ تھوڑا سا انحراف کر کے ”و“ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ کبھی ”ب“ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اولاً تو ”و“ کے مقام پر دونوں خطوط کے درمیان بہت کم فاصلہ نظر آئے گا۔ لیکن اُن کے بڑھ کر ”و“ کے مقام پر یہ فاصلہ اور بھی زیادہ ہو جائے گا اور ”ج“ کے مقام پر تو بہت ہی زیادہ ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ حالانکہ دونوں خطوط کا نقطہ

آغاز (STARTING POINT) بھی ایک ہے اور منزل مقصود (DESTINATION) بھی ایک ہی تھی۔ مگر ایک خط صحیح راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے منزل مقصود تک پہنچ گیا اور دوسرا اپنی جدت طبع سے دوسرا راستہ اختیار کر کے منزل سے کوسوں دور ہو گیا۔ **وَاتَّخَذَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا فَاتَّبَعُوهُ وَذَكَرَ الْبَلَاءَ ۖ فَخَفَّفَنَّا**
يُكْفِّرُ عَنْ سَيِّئِهِ۔

اسی طرح حسب ذیل مثال پر عمل کر کے دیکھئے کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔
ایک خال پیالہ میں ایک بیدی لکڑی اس طرح دکھ دیکھنے کہ لکڑی کا کچھ حصہ پیالے سے باہر نکلا رہے اور بغور دیکھئے کہ لکڑی کس سے ٹیڑھی تو نظر نہیں آتی۔ یقیناً آپ کس کے کہ لکڑی بالکل سیدھی ہے۔ اب اسی پیالہ کو پانی سے بھر دیجئے اور پھر لکڑی کو بنور دیکھئے۔ لکڑی کا وہ حصہ جو پانی میں ڈوبا ہوا ہے آپ کو ٹیڑھا نظر آئے گا۔ یہ کیوں؟ اس کی تشریح سنئے۔ پیالہ میں پانی بھرنے سے قبل لکڑی کے ہر حصہ سے جو روشنی کی شعاعیں چلتی تھیں وہ صرت ہوا کے ماحول (MEDIUM) سے گزر کر آنکھوں تک پہنچتی تھیں کیونکہ ہوا پوری فضا (ATMOSPHERE) کو گھیرے ہوئے ہے۔ جہاں کوئی دوسرا ماحول موجود نہ ہو، وہاں ہوا خود بخود موجود رہتی ہے۔

اسی لئے لکڑی حقیقتہً جیسی سیدھی تھی ویسی ہی نظر آرہی تھی اور جب پیالہ میں پانی ڈالا گیا تو ماحول میں آئینہ ش پیدا ہو گئی۔ اب پانی میں ڈوبے ہوئے حصہ سے روشنی کی شعاعیں چلتی ہیں ان کا ساتھ سطح آب تک آتے ہی ہوا کے ماحول

(MEDIUM) سے پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ٹیڑھی (REFRACT) ہو جاتی ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ لکڑی کا وہ حصہ جو سطح آب سے باہر ہے وہ پیالے ہی جیسا دکھائی دیتا ہے مگر جو حصہ زیر آب ہے وہ ٹیڑھا دکھائی دیتا ہے حالانکہ لکڑی اب بھی حقیقتاً وہی ہے جو پہلے تھی اور ویسی ہی سیدھی ہے جیسی پہلے تھی۔ مگر زاویہ نظر (ANGLE OF VISION) بدل جانے کی وجہ سے ٹیڑھی نظر آرہی ہے۔

یعنی یہی حال ذہن کا ہوتا ہے جب تک ذہن پر کسی ماحول کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک وحدانیت (MONOTHEISM) ذہن کی پوری فضا (ATMOSPHERE) کو گھیرے ہوئے رہتی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی ماحول کی عدم موجودگی میں ہوا پوری فضا (ATMOSPHERE) پر تسلط رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں ذہن کی شعاعیں جب اشیائے معقولہ تک پہنچتی ہیں تو ان میں کسیں بھی کمی نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے وہ اشیاء فی نفسہ جیسی ہوتی ہیں ویسی ہی نظر آتی ہیں اور ذہن ان کا صحیح ادراک کرتا ہے۔ لیکن جب وحدانیت کی فضا دوسرے اثرات کے ماحول سے مکدر ہو جاتی ہے تو ذہن کی شعاعیں اشیائے معقولہ تک پہنچنے پہنچنے ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ذہن کے لئے ان کا صحیح ادراک ناممکن ہو جاتا ہے۔

اب اگر وحدانیت کی فضا دوسرے اثرات سے اس طرح مکدر ہو چکی ہے کہ ذہن پر ثنوت (DUALISM) کے ماحول کا غلبہ ہو گیا تو ذہن ان کی شعاعیں اشیائے معقولہ تک پہنچنے پہنچنے کا ٹیڑھی (REFRACT) ہو جائیگی۔ اس لئے ذہن ان کا صحیح ادراک

دکر سکے گا۔ اور اگر وحدانیت کی فضا کو کندہ کرنے والے اثرات ایسے ہیں جو ذہن پر تشکیک (TRUTHISM OR TRINITY) کے ماحول کا قلب کر دیتے ہیں تو ذہن کی شاعوں میں ایشائے منہجہ پہنچتے اور بھی کجی (REFRACTION) آبجائی اور کس وہ اثرات ایسے ہوئے جو ذہن پر امان پرستی (POLYTHEISM) کے ماحول کا قلب کر دیتے ہیں تو ذہن کی شاعوں میں اس قدر کجی آجائے گی کہ ایشائے کچھ کا کچھ نظر آئیں گی۔

بناب غلام جیلانی صاحب برق کے ذہن پر ثنویت کے ماحول کا غلبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے انہیں تمام چیزیں جنت نظر آتی ہیں۔ پہلے دو قرآن نظر آئے تھے اور اب حال ہی میں ہی موصوف کو اسلام بھی دو ہی نظر آنے لگے اور اس موضوع پر ایک کتاب دو اسلام کے نام سے تصنیف کر ڈالی۔ اب دیکھئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر خدائے قدوس کے بارہ میں کیا اوقیر اختیار فرماتے ہیں۔

موصوف نے ایک قرآن تو وحی متلو جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں کو قرار دیا ہے جس کا نام علی قرآن رکھا ہے اور دوسرا قرآن صحیفہ کائنات کو قرار دیا ہے جسے "علی قرآن" کے نام سے موصوف کیا ہے۔ لیکن پوری کتاب میں موضوع بحث صرف صحیفہ کائنات یا الفاظ جیلانی صاحب "علی قرآن" ہی ہے۔ علی قرآن کو بظاہر کواہر اہمیت ہی نہیں دی گئی اور اس صحیفہ کائنات کے مطالعہ کو عین اسلام قرار دیا گیا ہے۔ دیکھئے دو قرآن "صفحہ ۱۱ و صفحہ ۱۲۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مظلہ مستم دالعلوم دیوبند نے پیش نظر کتاب

میں برق صاحب کے نظریہ پر اصولی تبصرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ جزئیات کے حسن و قبح کا دائرہ ان کلیات پر ہوتا ہے جن کے ماتحت وہ جزئیات ہوتی ہیں اور اور ان کلیات تابع ہے ذوق اور ذہنیت کے اس لئے اگر ذوق اور ذہنیت سلیم اور مستقیم ہے تو اس ذہنیت سے ابھرنے والے کلیات اور کلام بھی صحیح ہونگے اور ان کلیات سے نکلنے والی جزئیات بھی۔ اور اگر ذوق کجی لئے ہوئے ہے تو اس سے نکلنے والے کلیات اور ان کلیات کے تحت میں آنے والی جزئیات دونوں کے اور اک میں غلطی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ذوق و ذہنیت کی اصلاح و تقویم پر سب زیادہ زور دیا۔ ہے اور اس اصلاح و تقویم کا نام تزکیہ رکھا ہے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی فریضہ قرار دیا جس کا ذکر قرآن پاک میں تعلیم سے پہلے بھی آیا ہے اور تعلیم کے بعد بھی آیت بتاوا علیہم ایمانہم ویزکیہم وعلیہم الکتاب وعلیہم الذکر۔ ہر بناوہ فیہم عز وکرمہم بتوا علیہم ایمانہم وعلیہم الکتاب وعلیہم الذکر۔

برق صاحب اسلام کا منشاء تفسیر کائنات قرار دیا تھا جس کے نتیجے میں انسان مادیات کا متاع بن کر رہ جاتا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مظلہ نے اسلام کا منشاء ایسے مکمل کا حصول قرار دیا ہے جو موجب رضا و النی ہے جس کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی ہے لہذا کائنات کو فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ہے۔ "ان عین قرآن کے مطابق ہے جو شان کو سفلیات و ذلالت اسٹاکر کائنات کے لامحدود و متحور میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے وہ تمام کائنات پر حکومت کرتا ہے اور کائنات کا ہر جزو اس کے اشارہ ابرو کی نقیل کرتا

اور مقصد نزول قرآن ہے) وہ بتائی گئی ہے جو آج کی مادہ پرست مغربی اقوام نے پیش کی ہے۔ یعنی مادیات کی ترکیب و تحلیل اور تجزیہ و تالیف کے ذریعہ ایجادات اور تمدنی ترقیات وغیرہ، مادہ کو جس کا نور علمائے اسلام پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا :-

”آج اہل مغرب لوہے، تانے، بانوہ اور دیگر خزانہ ارضی سے نائیدہ اٹھا کر فلک

علم و ہنر پر آفتاب بنے ہوئے ہیں، ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں اور دریاؤں میں

غیر رہے ہیں، زمین کے بید ترین اطراف کی خبریں لمحوں میں سن رہے ہیں اور

تجسس سے رٹیں دوڑا رہے ہیں، مٹے واسے حوادثِ سماویہ رپا ہوا ہوں) کی

خبریں دے دے رہے ہیں یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ محض کائنات کا مطالعہ کرنے کے

بعد اسی کے قوانین و آیات کو اپنی بتری کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور

دوسری طرف ہمارا خدا ہی رہنا یعنی مٹا اعمالِ خدا سے اس قدر جاہل، منشاء

الہی سے اس قدر گورا اور مطالعہ کائنات سے اس قدر بیگانہ ہے کہ اسے

اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہوا میں چراغ کیوں بجھ جاتا ہے؟ اور آگ کیوں بجھ

اُٹھتی ہے؟ دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ سانس کی آمد و رفت کیوں ہے؟

دست و پا دل و دماغ و حواس و اعصاب اور عروق و عضلات میں اللہ

کے کون کون سے معجزات موجود ہیں؟ درجہ ہمارے بچے کی تخلیق کس

طرح ہوتی ہے؟ مرد و زنانہ کا کمرہ ارض پر عمل کیا اور کیوں ہے؟

الغرض مٹاے اسلام اعمالِ الہی سے یکسر غافل، معجزاتِ تخلیق سے قطعاً

۱۲

سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ :-
 ”مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا

ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و نكوة، حج طلاق قرین وغیرہ پر ڈیڑھ سو

آیات ہیں اور مطالعہ کائنات کی سات سو چھپن، (دور قرآن ص ۸)

(حالانکہ انہیں پتہ نہیں صرف ایک نماز ہی کی تاکید سات سو آیتوں میں

فرمائی گئی ہے)۔

پھر ان مقدمات سے نتیجہ نکالتے ہوئے کہ نزول قرآن کا اہم مقصد ہی کائنات

کا مطالعہ ہے، دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان مادی اور فکری امور سے انتفاع اور استفادہ

کرنا ہی قرآن کا اصل موضوع اور حقیقی منشاء خداوندی ہے جس کو ترقی کنسا

چاہئے بلکہ یہ استفادہ و انتفاع ہی وہ حقیقی دین ہے جس کو لے کر قرآن نازل

ہوا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :-

(ہ اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں صلابہ ارضیہ و فغانِ جبال اور خزانہ ہمار

سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہمدرد نہیں بناتی

تو یہ کتاب (خاک بہ ہوں) صراحتہً قاض و باطل ہے اور اس کا دعویٰ التیوہ

اَلْکَلْمَتُ نَکْمَرُ یُنَکْمَرُ (میں نے آج تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا)

فوقِ باطل ہے بنیاد ہے“ (دور قرآن ص ۸)

پھر اس کائنات سے استفادہ کی صورت (جو بزرگِ برحق صاحبِ منشاء خداوندی

نا آشنا، فطرت کے ایمان افراد کارناموں سے بالکل بیگانہ ہے اور پھر
بھی علم کا مدعی ہے " (رد قرآن ص ۷)

پھر کہا گیا ہے کہ خلافت الہی کے معنی بھی اسی مادی ترقی کے ہیں جس کے لئے
خدا نے انسان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنا کر آنا ہے اور یہی اطاعتِ خداوندی
ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

"وہ زمین پر انسان اللہ کا قائم مقام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ مادہ کو توڑ پھوڑ
کو تخلیق کے نئے نئے مناظر دکھاتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اللہ کی پروردگی
کو ناچاہیے اور کہے تا بنے اور دوسرے معادن سے موٹریں، جہاز اور
دیگر قوت کے سامان تیار کرنا چاہئیں۔ اطيعوا اللہ، اطيعوا اللہ کی احکامات
کو رو " (رد قرآن ص ۷)

پھر رد قرآن ص ۷ پر کہا گیا کہ :-

"وہ ایمان مادی درحقیقت یہی دنیا داری ہے، یعنی زہری اور مادی ترقی ہی
وہ علو و عظمت ہے جس کو قرآن نے "اَنْتُمْ اِلٰهٌ عَلٰوُن" کے
عنوان سے ظاہر فرمایا ہے، اس لئے حقیقتاً مومن مغرب کی وہ ملحد
اقوام ہیں جو اس مادی جڑ توڑ میں اس وقت سب سے آگے ہیں،
اور کافر و منکر درحقیقت اس وقت کی وہ ملحد اقسام ہیں جو ان مادی وسائل
اور ان کی ترقیات میں فی زمانہ سپہانہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

بہر حال تا یقین زیرِ نظر کے دعاوی اور مقاد کا خلاصہ یہ ہے کہ منشا
خداوندی مقصد نزولِ قرآن، معنی ایمان، مطلب خلافت اور حقیقی علو و عظمت یہی
مادی وسائل کی ترقیات اور یہی کرہ ارض کے مختلف خطوں کی سکمرانی ہی ہے اور ان
ہی بخوبی امور کے تکمیل کنندہ فی الحقیقت خلفائے الہی، قرآن کے وسیع اور اللہ کے
مومن وقاوت بندے ہیں، ورنہ جو لوگ بھی ان سائنٹیفک ترقیات و ایجادات سے
نا بلند ہیں وہ علم قرآن سے نا بلند فہم قرآن سے عاری اور منشا الہی سے جاہل ہیں۔
تمہید کی اس اصولی بحث کے بعد معتقد نے اسی اصول کی روشنی میں آئندہ
پوری کتاب میں جزئیات کا ذخیرہ پیش کرتے ہوئے مختلف آیات قرآنی سے اس
دعوے کو ثبات کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کا یہی استعمال مطالعہ اور اس
کے مواد و عناصر میں یہی ایجادات و تفرقات اس کے کھلے اور چھپے خزانوں کی یہی
تفسیر اور ان سے نفع اٹھانے کے لئے زندگی کو وقف کر دینا ہی تخلیقِ انسانی
کا مقصد اور قرآن حکیم کا حقیقی منشا ہے۔

جہاں تک سائنس کے اصول کے مطابق قرآنی آیات کو کائناتی آیات پر
ڈھالنے اور بخوبی جانبات کو قرآن کا موضوع دکھلا کر تشریح کی اس معجز کتاب سے
ان کے استخراج کا تعلق ہے، برقِ صاحب کی یہ کاوش اور خدمت کوئی نئی اور
انجوتی خدمت نہیں ہے، ان سے پہلے علامہ مشرقی (فاکس ایلڈر) اپنی کتاب "تذکرہ"
میں اور ان سے بھی پہلے علامہ مظاہرِ معری اپنی تفسیر جواہر القرآن میں اس خدمت

کو اپنی م دسے چکے ہیں اور اصحاب نظر اس کا کھرا اور کھٹا بھی واضح کر چکے ہیں اس لئے
برق صاحب کی زیر نظر تالیف ایک ہماری اور ایک ہندی کا نقش قدم ہے جسے
نقش ثالث کے طور پر انہوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم ایک علمی کاوش کی حیثیت سے
ان کی یہ محنت بایں معنی قابلِ لحاظ بھی ہے کہ اس سے علمی سلسلے کے کچھ نئے پہلو ایسے
پیدا ہو گئے ہیں جن پر ناقدانہ غور و فکر کرنے سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی
گوشوں کے کھل جانے کا موقع نکل آیا ہے۔ گو خود برق صاحب کے پیش کردہ پہلو
منشاء قرآنی اور قواعدِ شریعہ کے سر تا سر خلاف ہیں، کیونکہ جس نظریہ اور
نصب العین کی روشنی میں یہ جزئیاتی پہلو سامنے لائے گئے ہیں وہ نظریہ خود قرآنی
منشاء اور موضوع قرآنی کے خلاف جارہا ہے۔ اس لئے یہ جزئیاتی کاوش بھی
قرآنی نقطہ نظر سے تسخیر نہیں ہوتی۔

جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہے

وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اگر کتنی ہی صحیح کیوں ہوں
خود ان کا حسن و قبح بذاتہ کوئی معیاری حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کی غرضی و خرابی کا معیار
درحقیقت وہ کلیات یا اصول ہوتے ہیں جن کے سلسلے سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔
مثلاً اگر ایک شخص مناسکِ شریعی فضائل بیان کرے مگر خود نماز کو ذکرِ اللہ اور قربِ
اللہ کے بجائے پہلوانی کے نقطہ نظر سے دیکھ کر ایک جہانی ورزش قرار دے تو اگرچہ
یہ فضائل خود اپنی جگہ کہتے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطہ نظر کے ماتحت غلط ہو

جائیں گے۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذبِ محض اور خلافِ واقعہ
ہو جائے گی۔ یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی
نقطہ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرتا ہو جو تبادُلِ افکار یا مظاہرہ
اجتماعیت کے لئے منعقد کی گئی ہو نہ کہ مظاہرہ عشق و محبت خداوندی کے لئے، تو
یہ سارے فضائلِ اصل نقطہ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے۔ اگرچہ خود یہ فضائل صحیح
اور مخصوص بھی ہوں، کیونکہ سلسلہ نظر بدل جانے سے ان کا استعمال بے عمل ہو گیا۔
اور وہ کذبِ محض ہو گئے۔

یا اگر ایک شخص قربانی جیسی عبادت کے مناقب تو شرعی بیان کرے مگر خود وہ
قربانی کو خفیہ نفس یا بدل جان سمجھنے کے بجائے معاشی نقطہ نظر سے محض غریبوں
کی غیر گیری کا ایک اقتصادی پہلو تصور کرے تو اس کی غرض و غایت صرف
اعانتِ فقر، و مساکین تلاش اور اس لئے خون بہانے کے بجائے پیسے خرچ کر
دینے کو کافی ہی نہیں بلکہ مفروضی سمجھے تو فضائلِ قربانی پر اس کا یہ سارا بیان غلط ٹھہر
جائے گا کیونکہ نقطہ نظر کے بدل جانے سے یہ فضائل قربانی کے فضائل ہی نہ رہے۔

یا اگر ایک شخص علم کی ضرورت و فضیلت پر قرآنی آیات پیش کرے ایک مائل
اور معقول تقریر کرے مگر عریان نقطہ نظر سے یہ علم اس کی نگاہ میں فلسفہ و سائنس
یا ہندسہ و ریاضی ہو تو یہ ساری تقریر اس لئے غلط ہو جائے گی کہ منصوص فضائل
کی یہ تقریر اس نے خود اپنے زاویہ نگاہ سے کی ہے نہ کہ قرآنی نقطہ نظر سے۔ گو
فضائل کی آیات و روایات اپنی جگہ بالکل حق اور درست ہوں۔

بہر حال نقطہ نظر کی تبدیلی سے جزوی مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے کیونکہ

ان کی صحت و سقم اور حسن و قبح کا مدار اس کلیہ اور اصولی نقطہ نگاہ پر ہوتا ہے جس کے ماتحت یہ جزئیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہ علمی اور نظری فرق ایسا ہے جیسا کہ عمل کے دائرہ میں شرعی حقائق و ثبوتات یا بے عمل استعمال سے سیئات بن جاتی ہیں۔ مثلاً غیبت میں سچ ہی بولا جاتا ہے غلط بیانی نہیں کی جاتی مگر پس پشت عیب بیانی چونکہ موجب فتنہ و فساد ذات البین اور بے عمل ہوتی ہے اس لئے یہی سچ قبیح بن جاتا ہے اور اس سے وہ مجھوت ہزار درجہ بھڑکاپٹا ہوتا ہے جو مصالحت ذات البین کے لئے بول دیا جائے۔

پس سچ فی نفسہ حسن ہے مگر سلسلہ استعمال قبیح ہو جانے سے وہ بھی قبیح ہو جاتا ہے۔ پس فتنائیں ہوں یا احکام اپنے حسن و قبح میں اپنے کلیات و نظریات کے حسن و قبح کے تابع ہوں گے خود ان کا ذاتی حسن و قبح معتبر نہ ہو گا کہ صرف اُسے ہی اثبات مدعا کی کافی دلیل سمجھ لیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ جزئیات جمع کر کے نقطہ نظر بنانا یا کلیہ اور اصول قائم کرنا فہم اور ذوق کے تابع ہوتا ہے اس لئے نظریہ کی خوبی و خرابی درحقیقت ذوق و وجدان کی صحت و سقم کے تابع ہے۔ اگر مذاق ہی سلیم یا شرعی نہ ہو اور وہ ذہنیت ہی مستقیم نہ ہو جس سے نظریات اُبھرتے ہیں، بلکہ شرعی حیثیت سے زینہ اور کجی لئے ہوئے ہو تو خلا ہر پہ کے نظریات اور استنباط کردہ اصول بھی اُسی زینہ اور کجی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اور اس سے پیداشدہ یا حکم کردہ تمام جزئیات و فرعیات اسی ایک جامع فیصلہ سے غلط ٹھہر جائیں گی کہ ان کا کلیہ اور نظریہ اور ان نظریات میں سمایا ہوا ذوق غلط اور ٹیڑھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس نقطہ نظر بنانے والی قوت یعنی ذوق اور ذہنیت کی اصلاح و تقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اسی اصلاحی عمل کا نام تزکیہ رکھ کر اُسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی اور بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بنائے کعبہ کے وقت اپنی ذہنیت کو دینی و نبوی صلاح و فلاح کے لئے ایک عظیم الشان رسول مبعوث کئے جانے کی دُعا مانگتے ہوئے یہی چار باتیں تلاوت آیات، تعلیم کتب، تلقین حکمت اور تزکیہ نفوس بطور فرائض رسالت اللہ سے مانگی تھیں جن میں سے آخری بات جو اولیٰ کی تین باتوں کے لئے اساس و بنیاد ہے یہی تزکیہ ہے جسے طلب فرمایا تھا کیونکہ اس کے بغیر دل کی درستی ہو ہی نہیں سکتی جو نقطہ نظر اور نظریات کے لئے نقطہ آغاز ہے۔

پس اس تزکیہ کا حاصل اصلاحِ قلب اور اصلاحِ قلب کے واسطے سے اصلاحِ اخلاق اور اصلاحِ اخلاق کے واسطے سے اصلاحِ ذوق و ذہنیت ہے تاکہ ذہن انسانی درست ہو کہ فہم، ذوق اور دل و دماغ کا رُخ سیدھا ہو جائے اور انسان ہر مسئلہ کو اُسی کے رنگ میں دیکھنے کا اہل ہو جائے نہ کہ اپنے نفسانی رنگ میں پرکھنے کا، جو اس پر ماحول یا عوارض وغیرہ کے سبب سے چڑھا ہوا ہو۔ پس نہ تو مفکر کا نقطہ نگاہ پھرا ہوا ہو کہ دیکھ ہی نہ سکے، نہ جھینکا ہو کہ ایک کے دو دیکھنے لگے اور نہ ناقص ہو کہ دو کو ایک دیکھنے کا شوگر ہو جائے۔ بلکہ جو کچھ ہو جتنا ہو اور جیسا ہو وہی بعینہ دیکھے۔ اَللّٰھُمَّ اَمِّرْنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا حَقَّی۔

حاصل یہ کہ محض اس کا ارادہ اور نیت ہی مسلمان نہ ہو بلکہ وجدان بھی مسلمان بن جائے کہ جو کچھ بھی وہ کتاب و سنت سے سمجھے اور دیکھے صرف اسلامی ذوق سے سمجھے اور دیکھے نہ کہ منکرانہ اور ملحدانہ ذہن سے۔ مثلاً ان ہی قرآنی آیات کو مشرکانہ ذوق و ذہنیت سے سمجھا جانے لگے تو ان کا رنگ اور ہوگا۔ نعرانی ذوق سے دیکھا جائے تو رنگ دوسرا ہوگا۔ یہودی رنگ سے دیکھا جائے تو رنگ دیگر ہوگا۔

آیات قرآنی ہر صورت میں وہی رہیں گی۔ مگر ان کے معنایں اور مقاصد کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جائے گی اور ہر رنگ میں عوام کو آیات قرآن کا ناپ لے کر مبتلائے فریب دکھا جائے گا۔

(پھر اسی طرح مسلم ناجامعوں کے مکاتیب خیال اور نقطہ ہائے نظر جیسا ہیں جو اسی ذوق و وجدان کے تفاوت سے متفاوت اور بدلے ہوئے ہیں۔

معتزلہ کا رنگ فہم اور ہے اور قدریہ کا اور خوارج کا ذوق فہم اور ہے اور روافض کا اور۔ اس لئے بمقدار زینغ و استقامت ان کے ذوق و وجدان کا صحت و سقم بھی متفاوت ہے۔ ان وجدانوں سے نکلے ہوئے انکار و نظریات بھی متفاوت ہیں اور ان نظریات کے تحت آیات و روایات کے انکار و معانی و مطالب بھی متفاوت ہیں جن میں زمین آسمان کا فرق و تفاوت ہے۔

مگر قرآن کا نام ہر جگہ یکساں ہے اور اسی کی امامت کے نام پر لوگوں کو ان نظریات و حکایت کی طرف بلایا جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ ان میں سے جس کے نظریات کو بھی غلط کہا جائے گا اور جو بھی کہے گا وہ آیات قرآنیہ کی تغلیط نہیں کرے گا بلکہ اس طبقہ اور فرقہ کے فہم پر حکم لگائے گا اور یہی حکم انجام کار اُس طبقہ کے ذوق اور

وجدان پر ہوگا نہ کہ آیات پر۔ پس اس کے ذوق کے غلط ہونے کی وجہ سے نظریات کو غلط اور ان نظریات سے استخراج کردہ مسائل کو غلط کہا جائے گا نہ کہ آیات و روایات کو۔ اس لئے کسی کے پیش کردہ نظریات پر غور و فکر کرنے کے سلسلہ میں اس کے ذوق و وجدان اور ذہنیت سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ ذوق و وجدان کی قربیت کا طریقہ سوائے ابواب ذوق و وجدان کی معیت اور کثرت ملازمت کے دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے لئے استناد و خلف اور شہادت سلف ہی سب سے بڑی حجت اور علامت سمجھ گئی ہے، اسی لئے ہر عالم کے علم پر حکم لگانے کے لئے اس کا سلسلہ سند اور اس کے اساتذہ کے دین و علم کی نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ سند ہی اس عالم کے علم کی صحت و سقم کی سبب بڑی شہادت ہوتی ہے۔ صحابہ کے صحت ذوق کی خاص صفت نبوی اور ذات بابرکات سے انصباغ اور آپ کے ساتھ استناد ہے جس نے مشرکانہ ذوق نکال کر ان میں وجدان ذوق و معرفت پیدا کیا ان کے قلوب کا راستہ سیدھا کیا جس سے ان کا نقطہ نگاہ ہر جگہ اور زینغ سے پاک ہو کر خالص استقامت کی راہ پر آگیا اور وہ ہر مسئلہ قرآنی و حدیثی کو باذلی و خدا اسی کے رنگ میں سمجھنے کے اہل اور عادی ہو گئے۔

تابعین کے لئے معیار سے استناد و انصباغ اور ان کی صحبت و معیت بابرکات قربیت ذوق ثابت ہوئی۔ تبع تابعین کے لئے تابعین سے استناد و ملازمت اور صحبت یا فکری اساس استقامت ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی طرح بعد کے قرون میں آج کے دور تک استقامت ذوق کے لئے اہل ذوق و وجدان کی سند

معیت و ملازمت اور محبت ہی سلامتی ذہن و ذوق کی بنیاد ثابت ہوتی رہی ہے جس سے دلچسپی اور متغنی ہو جاتا ہے محبت ذوق کا عناصر رہا ہے۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل ادبائے فتنہ میں اس سند و شہادت سے گریز، اہل اللہ کے اقوال و مذاق کی پیروی سے پہلوتی، اہل دل کی معیت و ملازمت سے انقطاع، اہل حال کے احوال مادقہ سے رنگ نہ پکڑنا، اپنے ذاتی فہم و عقل پر غور و گفتہ کرتے ہوئے سابقین کے فہم کو اپنے فہم کے لئے کوئی نہ سمجھنا یا بالفاظ دیگر اُن کے فہم سے اپنا فہم نہ بنانا ہی اس میں فہم سمجھا گیا ہے اور فہم کی جگہ غور و فہم پر قناعت کر لی گئی ہے۔ اس لئے مسائل فہمی میں اس کا وہی ذہن و ذوق امام رہا جو تہہ بیت

سے عاری، رنگ انقیاد سے خالی اور صبغۃ اللہ سے کورا رہتا آیا ہے اور جب میں روحانی معرفت کے بجائے جہلی اور نفسانی خیالات، مگر وہ پیش کے حالات اور وقت و وقت کے محرکات سے ذہنی موعوبیت کے جذبات بھرے ہوئے رہ جاتے ہیں جو اس تاثریت یافتہ ذہن کی پیداوار اور نفس کے اختراعات ہوتے ہیں۔ مگر غور و فہم سے ان کو مدلولات قرآن و حدیث سمجھ لیا جاتا ہے تا آنکہ ان ہی ناہموار جذبات سے نظریات اور نقطہ ہائے نظر ابھرنے لگتے ہیں جن سے جزئیات فہمی کا سلسلہ پل پڑتا ہے۔ اس لئے وہ جزئیات خواہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں مگر ان غلط و مجذبات و افکار کے سانچے میں ڈھلنے کے بعد اس لئے قابل قبول نہیں رہتیں کہ اُن کے وہ مختصر اصول ہی قابل رد ہوتے ہیں جو نئی آئینہ فہم و ذوق سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

پس بحث و نظر اور نقد و تبصرہ کے وقت اصل میں یہی غلط نظریات رد

کئے جاتے ہیں نہ کہ قرآنی جزئیات۔ گو بلا ہر رد و قبول کا عمل ان پر جاری نظر آتا ہے۔ اس لئے استدلال میں قابل توجہ وہ جزئیات نہ ہوں گی جو پیش کی گئی ہوں بلکہ وہ احوال و نظریہ اور اس سے آگے وہ ذوق ہو گا جس سے یہ جزئیات ابھری ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید رکھی حالانکہ وہ نفس توحید کے منکر نہ تھے۔ نبوت پیش کی حالانکہ وہ نبوت کو بھی مانتے تھے۔ مبداء و معاد پیش کیا حالانکہ وہ اس کے بھی قائل تھے، مگر پھر بھی انہیں منکر و کافر کہا گیا اور اُن ہی عقائد کی دعوت دی گئی جن کے وہ کھینچے منکر نہ تھے، محض اس لئے کہ وہ ان مسائل کو مشرکانہ نقطہ نظر سے دیکھتے اور سمجھنے کے خواہر تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مومنانہ اور مسلمانہ ذہنیت سے سمجھانا چاہتے تھے۔

۱ بالفاظ دیگر انہیں محض مسائل ہی سمجھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُن کی ذہنیت اور ذوق و وجدان کو بھی تبدیل فرمانا چاہتے تھے تاکہ حقائق کا صحیح مفہوم ہمیشہ اُن کے ذہنوں میں اُترا کرے اور محض اُن کے ہاتھ پاؤں اور زبان ہی مسلم نہ ہوں بلکہ اُن کا دل و دماغ اور ذہن و وجدان بھی مسلم بن جائے لیکن جب انہوں نے اس سلسلہ ہی کو قبول نہ کیا جس کی یہ جزئیات تھیں اور اس ذوق ہی کو نہ اپنایا جس سے یہ سلسلہ چلتا تھا تو وہ مسلم بھی نہ کہلائے، گو فی الجملہ وہ ان تمام مسائل کے قائل تھے۔

مجھے معلوم کیا جائے، اگر نہیں یہ عرض کروں کہ برق صاحب نے علی قرآن اور کائنات قرآن کی اس باہمی تطبیق کو دکھاتے ہوئے جن مسائل کی طرف رہنمائی کی ہے وہ محل یا ان میں سے بعض خواہ فی نفسہ صحیح بھی ہوں، مگر قابل تسلیم ہرگز نہیں ہیں۔ کیونکہ ان مسائل کو جس سلسلہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جس نقطہ نظر کا ثبوت دیا گیا ہے اور اس نقطہ نظر میں جس ذوق و ذہن سے کام لے کر ان مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ بظاہر غیر تربیت یافتہ اور خود اپنے ہی اختراعات کے دھوکہ میں آیا ہوا ہے۔

۹۱۰ برق صاحب نے قرآن کو اس کی حقیقی تشریحات سے الگ کر کے محض ذوق مطالعہ اور محض اپنے ہی ذہنی دُش سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، لہذا نقطہ نظر انہوں نے قرآن کو تقویٰ و طہارت، اخلاق و روحانیت، زہد و عبادت، خشوع و انابت، اتباع سنت و اقتضائے آثارِ رسول اور خلافتِ الہی کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عہدِ بنیادوں، فلسفہ و سائنس، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات و سیاسیات، تفریح و تفریح اور تکیا جہ و اقتدار یعنی ملوکیت و سلطنت اور موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار و نظریات کے نقطہ نگاہ سے دیکھا تو انہیں ہر آیت میں سے خالص مادیات کا ایک سیلاب اُمنڈتا ہوا نظر آیا اور آج کی متمدن اور برعکس نام نہاد مہذب اقوام کی عشریات و ترقی ہی ان کی مرعوب نگاہ میں قرآنی ترقی اور اس کا نصب العین دکھائی دینے لگی۔ حتیٰ کہ یہ مادی کھودگرید اور اس کے موالیہ دُخان و بنیاد، گیس و برق، ایل و تار، لیڈرہ و سیاہ اور فون و لاسکی وغیرہ۔ پھر ان وسائل نقل و حمل اور اسباب

علم و فہر کے وسیلہ سے ایک طرف اسبابِ زینت و تہذیب کی توسیع سے دنیا میں ہوسناکی عیاشی، حرص و آرزو، بد اخلاقی و سیاہ کاری اور صد نوع فسق و فجور کی وسعت و کثرت اور دوسری طرف اسبابِ تباہی و ہلاکت اور مسلکِ آلاتِ حرب و ضرب، گن اور بم، ایٹم اور گیس و بارود اور تینراب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوامِ عالم پر زور آزمائی، غلام سازی، قتل و غارتگری، اعلانِ جہاد و جہاد اور عالمی امن و سکون کی بربادی کی ہمتاں اور پھر یہ سب کچھ بنام امن و صلاح، یعنی مکمل عیاری و دیکھاری، ڈپلومسی، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت ہمہ گیری۔ خلاصہ یہ کہ اس مکر و فریب کی راہ سے ان غیر متمدن اور از حد و رفتہ عیاشیوں اور حد سے گزری ہوئی تباہ کاریوں کے پردے میں ہمہیت کا غلبہ، درندگی کا زور، اور شیطنیت کا استیلا ہی (جو ان اسبابِ تہذیب و ہلاکت کی افراط کا قدرتی نتیجہ ہے) برق صاحب کے نزدیک نبوت و خلافت کی اصلی غرض و غایت ٹھہر گیا اور اس دنیا داری ہی کو انہوں نے یا نہاری قرار دے دیا۔ حالانکہ اس کے شانے کے لئے تو انبیاء کی نبوت اور خدا کی خلافت دنیا میں آئی تھی۔

پس موصوف نے اپنی برق رفتاری سے نبوت و خلافت کی غرض و غایت اُسی کو اُٹ دیا اور قلبِ موضوع کلاس اُٹ پھر میں اگر ایک ٹکڑے ہوئے روحانی اور اخلاقی نصب العین کو خالص مادی نصب العین بنا دیا۔

لیکن اس مادہ نقطہ نگاہ کا نہایت ہی مسلک اور خطرناک نتیجہ ایک تو یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرنِ اول اور صحابہِ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف

تقلیل العلم اور محروم العمل قرار پا جاتا ہے جس نے منشاء قرآنی کے مطابق
 نہ ایک مشین بنائی نہ ایک آئین ہی ایجاد کیا۔ نہ دُخان و بخار سے ٹکلیں چلائیں۔
 نہ خوبصورت چھری کا نئے ڈھالے۔ نہ کریم اور پاؤں دیتا رکھے۔ نہ چہروں کو
 لگلوں بنانے کے لئے غانڈے اور لوٹن بنانے کے لئے آرائشی سامانوں کی تخلیق کی۔
 نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے، نہ پانیوں میں بہتے دکھائی دیئے۔ نہ کسی نے مہنگ
 آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں مٹایا کیا، نہ استعماری
 اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر و استبداد اور ظلم و ستم چلایا۔ نہ سائنٹیفک آلات
 کی طاقت کے بل بوتے پر قوموں کی غلام سازی کی۔ نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر
 زیر و تنوں کے کچلے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی اور نہ ہی دنیا کا
 سرمایہ سمیٹ کر آلات و مواعیل، ہابے گاجے، سینما و تھیٹر، فواحش و منکرات
 کے مناظر، بے حیائی اور بے حجابی کے عریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت
 کو فروغ دیا۔

غرض برق صاحب کے تجویز فرمودہ منشاء قرآنی کے مطابق نہ مشینی تمدن
 برپا کیا نہ بجلی سے بلب لگائیں بلکہ گائیں، نہ ڈامر کی مڑکوں پر موٹریں دوڑائیں اور نہ
 خود ہی ان تفریحات و تہنیشات کی لائٹوں پر دوڑے۔ اس لئے اسلامی اور
 قرآنی حیثیت سے قرن اول کی زندگی معاذ اللہ سب سے زیادہ ناکام اور اسلام
 سے بعید زندگی ہے۔

ادھر اس کے برعکس جوں جوں قرن نبوت سے بُعد ہوتا گیا اُسی قدر یہ
 سائنٹیفک ترقیات بڑھتی گئیں گویا علم قرآنی ترقی کر گیا۔ نعم انسان تیز تر ہوتا

گیا اور علم بالقرآن کا ذوق بڑھ گیا۔ گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا، ہی
 اُمت کے حق میں رحمت ثابت ہوگا کچھ اور مذہم صحیح ہو گئے اور لوگ ایمان داری
 کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لائق ہو گئے اور قرن نبوت کی موجودگی میں اُمت کو فکرو
 علم اور عمل کے لحاظ سے حرمان و حرمان کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ پس برق صاحب
 کے ان اختراعی مقدمات کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرن اول بلحاظ علم و عمل حمازہ
 شر القرون ثابت ہو گیا اور یہ آج کا شر القرون خیر القرون بن گیا۔ حالانکہ کولسان پنیغیر
 پر خدائی دعوے یہ تھا کہ :-

خَيْرَ الْقُرُونِ قُرُونُ نَبِيِّ مُحَمَّدٍ
 الَّذِيْنَ يَكُوْنُ لَهُمْ نِعْمَةُ الَّذِيْنَ
 يَكُوْنُ لَهُمْ -

”زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ ہے، پھر وہ لوگ
 جو خیر القرون والوں سے متصل ہوں اور پھر جو ان
 لوگوں سے متصل ہوں۔“

پس کلام نبوی میں تو عہد نبوت کا خیر و برکت اور اس کی وسعت و کثرت
 کی طرف اور زمانہ مابعد میں رفتہ رفتہ اس خیر و برکت کا قلت اور منفع کی طرف
 بڑھتے دہنایا گیا ہے۔ مگر کلام برق سے قطعاً برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ ادھر
 کلام نبوی سے تو نبوت عالم کے لئے رحمت ثابت ہو رہی ہے اور کلام برق سے
 رحمت ثابت ہوئی۔ قرآن نے تو ایمان داری کا مفہوم علم نافع کے ساتھ حسن
 اخلاق اور فضائل اعمال قرار دیا تھا جس کا سرچشمہ نبی کی روحانیت ہے اس
 لئے قدرتی طور پر ایمان داری کی ترقی کا اعلیٰ ترین وقت تو زمانہ نبوت اور اس
 سے قرب، اور اس کے متنزل کا وقت نبوت اور اُس سے ملحقہ زمانوں سے
 بُعد ہی ہو سکتا ہے۔ مگر کلام برق میں ایمان داری کا مفہوم دینا داری یعنی ترقی

اور سائنٹیفک عبادات ہیں جن کا سرچشمہ عقل معاش اور خالص مادیت ہے اس لئے قدرتی طور پر ان کی مزعومہ ترقی تو عہد نبوت سے بعد میں اور ان کی پستی یا ان کا وسیلہ محض وہ کہ سر بلند نہ ہو سکا نبوت اور اس کے قریبی زمانوں ہی میں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک امتی کے کلام کو نبی کے کلام سے یہ بعد اور نتیجہ کلام میں نبوت سے یہ مزید معارضہ، نتیجہ ہے ذہن اور نقطہ نظر کے تاریکی یا رہ جانے اور ذوق کو ذلیف آمیز چھوڑ دے رکھنے کا، یہی نہیں بلکہ برق صاحب کے اس اصول پر سارے ہی انبیاء علیہم السلام پر حریف آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے دہر میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ہوتیں ہر بار شدہ ترقیات بھی فنا کے گھاٹ اتار دی گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دورِ خیر و برکت میں تمدنی تعققات اور عیش دنیا کے گھڑے ہوئے تکلف آمیز نقشے اپنی پوری روحانی قوت سے منائے ہیں جن کو قائم کرنے میں مادی مزاج اور فلسفی طبع لوگوں نے انتہائی کاوشیں دماغ اور استعداد دکھائی تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پیر دیا تھا۔ جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھیں اور لوگوں کو پھر سے اُسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات اور افراط عیش کا وجود نہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعونوں کا وہ ملکی اور شہری کرد و فرختم کر کے چھوڑا جس پر فرعون اَلْاَیْسَ لَیْ سُلْطٰنٌ بِقَوْمِہٖ ذٰلَکَ لَا نَبِیْہِمْ بَعْدَہِیْ تَحٰی کَمَکَ فخر کیا کرتا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدن پر لانے کی کوشش فرمائی۔

بنی اسرائیل جب بھی اس تمدن کی تکلف آمیز رنگ دلیوں میں پڑے اور طبعی نتیجہ کے طور پر فساد فی الارض میں مبتلا ہوئے۔ اُسی وقت اُن پر غلاب خداوندی مسلط ہوا اور دوسری جاہل قریب بخت نصر، بیش رومی وغیرہ اُن پر مسلط ہو گئے اور بنی اسرائیل کو محکوم اور غلام بننے کے سوا چارہ کار باقی نہ رہا۔ اور بالآخر جب بھی متنبہ ہو کر انہوں نے اُن تمدنی تکلفات اور اُن کے خواص و آثار یعنی سرکشی اور ظلمیان کو خیر باد کہا اور اُسی سادہ اخلاقی تمدن پر آئے جو ہمیشہ سے انبیاء کا تمدن رہا ہے وہ پھٹنے لگے اور از سر نو اُن کا گیا ہوا وقار و اقتدار بازیافت ہوا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے دو عظیم الشان مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کرد و فر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا پرداز ڈالا اور اُن کے مٹ جانے کی پیشین گوئیاں فرمائیں جن کے مطابق آپ کے پاکیزہ صحابہ نے عین منشاء نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے اُن تکلف آمیز تمدنوں اور ان کی سرپرست حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا اور وہ سادہ تمدن قائم کر دیا جو مقاصدِ عبودیت میں حارِج نہ ہو۔ کسریٰ کے وہاٹ ہال کے بے نظیر سامانوں مافوق العادت سیم وزر کے خروٹ و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ مولوں کے المول قالمینوں وغیرہ کو دیکھ کر جو سلسلہ مالِ غنیمت مسجد نبویؐ میں لائے گئے، فادوق اعظمؐ ٹپو پڑے اور فرمایا کہ یہی وہ سامان تعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی محکوم اور مفتوح بنی۔ ڈرہے کہ یہ مسلمان کہیں ہیں بھی مبتلائے تعیش کر کے کسی قوم کا مفتوح اور غلام نہ بنادے۔ ظاہر ہے کہ

فاروق اعظم کو یہ ڈر ملا تھیست کی سادگی سے نہ تھا بلکہ اسی معادن ارضیہ، دفائن
جبال اور خزان بھار کے یقین سامان تمدن سے تھا جس کے سائنٹفک نمونے
اُس وقت قیصر و کسریٰ نے دنیا کو دکھلائے تھے اور آج داتا یان فرنگ پیش
کر رہے ہیں۔

خلفائے راشدین یا ملوک عادل کے زمانوں میں تمدن سادہ اور اخلاقی رہا
سامان عیش و نشاط کم سے کم اور سامانِ طاقت و تباہی تقریباً مفقود رہا۔ اس
لئے اسلامی فتوحات اور دائرۂ خلافت کی وسعت و قوت بھی اُسی دور کا طرہ
ابتداء ہے۔ جو جن عجبت اور بالفاظ دیگر قیصریت و کسرت اور بالفاظ
واضح مادیت اور اُس کی تعیش آفریں صورتیں پیدا ہوئی رہیں، اخلاقی ترقیات
کے قدم سست پڑتے گئے اور ہجوم و اقدام کے بجائے کھانے، پاشنے پر
غائر جنگلیاں بڑھتی گئیں اور سلمان اولامن حیث المذہب اور پھر جن حیث القوم
نوبہ اسقاط ہوتے گئے۔

پانسو برس بعد اسی تعیش اور تمدنی تکلف نے عربوں کی دولت ختم کر دی جو
پھر لوٹ کر نہیں آئی اور دوسرے پانسو برس کے بعد بتدریج ترکوں کی دولت ٹوٹ
لی جو پھر اپنی اصلیت پر نہیں لوٹی اور بالآخر تیسرے پانچ سو کے آغاز میں اسلامی
قوم لعزائی اقوام کی سنگینوں کے نیچے آئی شروع ہو گئی جس سے آج تک بھی اسے
چھٹکارا نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا عربوں اور ترکوں نے جن قوموں سے سائنٹفک
ترقیات اور تمدنی تکلفات کا ورثہ پایا تھا بالآخر ان ہی کی غلامی اور محکومگی بھی
ورثہ میں پالی۔ اور اب جن اقوام نے عربوں اور ترکوں سے کسی اور نمائشی تمدن و

ترقی کا ورثہ حاصل کیا تھا وہ بھی آخر کار اُن ہی کے انہام کی طوٹ بڑھتی نظر آرہی
ہیں کسی کی چودھراٹ ختم ہوئی، کسی کا ملک گیا، کسی کے اقتصادیات مٹے اور
کوئی خود سے گئی۔ غرض کہ یہ مقدمات ہیں سب کچھ چلے جانے کے۔

حاصل یہ ہے کہ اقوام کا حدوث و بقا، بالآخر اسی سادہ معاشرت اور
بے تکلف تمدن سے وابستہ ہے جو ان سائنٹفک ترقیات و تعیشات اور
نام نہاد ایمادات کی آلائشوں سے پاک ہو اور بجائے ہوس اقتدار اور حرص
تعیش کے اخلاقی اور روحانی قوتوں پر قائم ہو۔ شاید برق صاحب کے نقطہ
نگاہ سے ان انبیاء کی بعثت اور اُن کے مسما بہ کا اُٹھنا معاد اللہ ایمان داری
اور اس کے شعبوں کی تخریب کے لئے تھا؟ اگر ایمان داری ہی دنیا داری اور اُس
کی تمدنی ترقیات ہمیں جنہیں مادہ کی توڑ پھوڑ سے بے شائبہ حق تعالیٰ حاصل
کیا گیا تھا تو اُن تابان الہی کو اس ایمان داری کے مٹانے اور اس کی جگہ
معاد اللہ ملا تھیست کی نادانستی، جہالت اور منشاء الہی سے بے خبری کو
قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

غور کیا جائے تو یہ وہی نقطہ نظر اور ذوق و ذہنیت کا فرق ہے۔
برق صاحب جس ذوق سے قرآن کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں اُس کی دوسری
یقیناً اسلام کا چہرہ معکوس نظر آتا اور اس کے محاسن کا معائب نظر پڑتا مگر زیر
تھا۔ انہوں نے اپنی عربوں ذہنیت کی وجہ سے قرآن کو طویلانی یورپ کے
نقطہ نگاہ سے دیکھا تو انہیں مہلک دنیا داری میں ایمان داری نظر آئی۔ اگر
وہ غیر انہوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے تو انہیں ایمان داری انبیاء کی سادہ معاشرت

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفُضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ
وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرِثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْخُلُوعِ
الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَ الْحَبَابِ ۝

کہیں پوری دنیا کی ان کلاہری ہماروں اور فانی سرسبزوں پر ماضی اور ماضی
ہو جانے کو بھرا نہ غفلت اور انجام کی بد حالی بتلایا۔ فرمایا۔

إِنَّا الْآدِثِينَ لَا تَرَجُونَ لِقَاءَنَا
وَسَرَّحُوا بِالْخَيْلِ وَالْذِّبَابِ طَعْمًا
تَوَابِعًا وَالْآدِثِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا
غَافِلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ مَا وَاعَدَ
النَّاسَ بَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

کہیں لذت دنیا میں غنیمت رہنے والوں کے بارے میں جاہل اور چھٹی
ہونے کی تلمیح کی۔ فرمایا :-

دَسَّحُوا لَكُمْ وَيَسْتَعْتَبُوا
وَيُلْهِمُوا الْأَعْمَلَ فَضُولًا
يَعْلَمُونَ ۝

ان کو چھوڑ دو، کھانے پینے دو،
مڑے اڑانے دو، باطل آندہوں ان
کو خدا سے غافل بنائے رکھیں گی مگر وہ

مزدور جان جائیں گے ۝
کہیں دنیا کی مالی فراوانی اور افزائش کو یا با اصطلاح عوام ننانوے کے
پھیر کی خاصیت کو گرفتار نہی لہو و لعب، یا بد انجام مشاغل میں پھنس جانا
بتلایا۔ فرمایا۔

أَلَمْ يَكُنْ لَهُ الْبَنَاتُ عَلَىٰ مِثْلِ الْبَنِينَ
الْعَقَابِ ۝

کہیں دنیا کے مال جمع، اکٹھا، ذخیرہ بازی، اور آج کی اصطلاح میں ملنے والی
پر عذاب الیم کی دھمکی دی۔ فرمایا۔

وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ الذَّهَبَ
وَالْفُضَّةَ وَلَا يَتَّبِعُونَ طَرِيقَ
سَبِيلِ اللَّهِ خُيِّرُوا
بِعَذَابِ الْيَمِينِ ۝

کہیں بے تحاشا کھانے پینے اور عیش دنیا میں غرق ہو جانے کو بہائم سے
تشبیہ دے کر ان کا انجام جہنم بتلایا۔ فرمایا :-

الَّذِينَ يَكْنُزُونَ كَمَا تَكُنُ الْأَنْعَامُ
وَالنَّاسُ مَثْوًى لَّهَا ۝

یہ لوگ اس طرح کھاتے پیتے جی طرح جانور کا
پاکرے ہیں ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ۝
کہیں دنیا کے بارگاہ و ہمار کی بے ثباتی دکھلا کر اور اس کے بہاریوں کی
بد انجامی دکھلا کر عبرت دلائی اور اس سے بے زار ہونے کی ہدایت
فرمائی ہے۔ فرمایا :-

كَمْ تَوَكَّلُوا مِنْ جَبَّتِ دُمُوعُهُمْ
فَ تَرَوْهُم مَّقَامًا كَرِيمًا
وَنِعْمَ التَّوَانِيذُ فَكَيْفَ كُنَّا لَكُمْ
وَدَسَّحْنَا قَوْمًا أَخْرَبَ مِنْ قَوْمِ نَبَايَا

”کس قدر باغات، چشے اور کھیتیاں اور
عہدہ عہدہ مقامات اور نعمت، جن میں
وہ لوگ مڑے اڑانے سے چھوڑ گئے، اسی طرح
ہم نے اُس زمین کا وارث دوسری قوم کو بنادیا

بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ
وَمَا كَانُوا مُنْجِبِينَ ۝
جس پر زمین روٹی اور آسمان اور نہ ان کو
کسی قسم کی نجات دی گئی ۝

کہیں اپنے پیغمبر پاک کو ہدایت فرمائی کہ دنیا کی اس چند روزہ ٹیپ ٹاپ کی
طرح کوئی ادنیٰ نعمت نہ کریں کہ یہ فتنہ اور بلا ہے۔ بلکہ صرف طلبِ آخرت اور
لگنِ عاقبت میں منہمک رہیں۔ فرمایا :-

وَلَا تَمْدَدْ عَيْنُكَ الْحَيَاةَ
مَامَتَعْنَابَهُ اَمْ وَاجِبَاتِهِمْ
نَهْصَرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
لِنَفْسِهِمْ فِيهِ وَهَرَقَ رِبَاكَ
خَيْرٌ وَابْقَا ۝
"ت پہلا دانی دو توں آنکھوں کو ن کھنچو
کی طرف جو ہم نے اُن لوگوں کو دنیاوی زندگی
میں دھلا کر دیا، اس لئے کہ یہ سب کچھ اُن کی
آزمائش کے لئے ہے، تیرے رب کا رزق بہتر
اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۝"

یہ دنیا کے اُس حصہ کی مذمت تھی جس کا تعلق باہ اور شہوت سے ہے، بعینہ
اسی طرح دنیا کے اُس حصہ کی بھی قرآن نے مذمت کی جس کا تعلق جاہ اور شوخ
سے ہے۔ یعنی یہاں کی ممکنات و قوت کی عددی اکثریت اور اولاد کی کثرت
بھی خدا کی طاقت کے سامنے بیچ ہے۔ اس لئے مال کو مقصود زندگی سمجھ کر
اُس میں عمر بزرگوار دنیا بالا طرح مان و خیران کا باعث ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے کہیں دنیا کی مادی شوکت و قوت، فرادانی
مال و دولت، اولاد و افراد کی کثرت، اور نفسانی لذت و فرحت کے
سیٹھے رہنے کو دنیا و آخرت میں بریادی عمل اور ناقابلِ تلافی گناہ قرار
دیا۔ فرمایا :-

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ كَانُوا أَشْذَ
مَنْكَ قُوَّةً وَكَثُرُوا مَوَادًّا
فَاسْتَمْتَعُوا بِغُلَاقِعِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ
بِحُلَاكِهِمْ كَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِالَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ غُلَا قِعُهُمْ وَخَفَضَهُ كَالَّذِي
خَاضُوا اَوَّلَ لَيْلٍ حَبَلَتِ اَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۝ وَاولَا لَيْلٍ
عَمَلُ الْخَاسِرِينَ ۝

کہیں ان مادی شوکت و قوت کے نظر فریب سامانوں (مثلاً ٹینک، ایروپلین،
ہم گیس اور توپ و تفنگ وغیرہ) اور عددی اکثریت کے لشکروں پر بے باطل طاقت
اخلاق و روحانیت بھروسہ کر بیٹھے کو اتنا تھا کی ضعف اور انجام کی ہلاکت قرار دیا۔ فرمایا :-
وَمَا اَعْدَاكَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ
عَدَا احْسَنَ اَثَانًا وَرَاسِيًا قُلْ
مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ
فَلْيَمْدُدْ لَهُ السَّمْعُ حَتَّى يَمْلَأَ
حَتَّى اِذَا سُرَّوْا مَا يَبْعُدُونَ اَمَّا
الْعَذَابُ وَاَمَّا السَّاعَةُ فَمَا لَيُبْلِغُونَ
مَنْ هُوَ شَرٌّ مَعًا نَا وَاصْف
جند ۱۵

ان سے پہلے ہم نے کتنے ہی لوگوں کو ہلاک کر
دیا جو سزا و مسلمان اور جن ظاہری رکھتے تھے،
کہہ دیکر جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں نہ
انکی دیکھ کر نہ دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھوں
دیکر لیتے ہیں اُس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے
عذاب باقیامت، اس وقت وہ لوگ مانیں گے
کہ کون از روئے عقاب بدترین اور قوت و طاقت
کے لحاظ سے کمزور ہے ؟

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہیں دُنیا کے ان دسی رضا کاروں اور مددگار جمعوں کی تحیر العقول عددوی اکثریت کا کھوکھلا پن ظاہر فرماتے ہوئے ان طاقتوں پر عبور رکھنے والوں کو ناعاقبت شناس اور بالآخر بے یار و مددگار رہ جانے والا بتلایا۔ فرمایا۔

حتیٰ اِذَا سُرُّا مَا يَبْعُدُونَ فَيَلْعَمُونَ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا تھا اُن
مِنَ اَضْعَفِ نَاصِرٍ وَاَقْلٍ سے سب طلم کر لیں گے کس کا کدو رہے مددگار
عدو ۱۔ اور کس کا کم ہے مدد۔

بہر حال عیش و نشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت و شوکت کے مضبوط و پختہ اسبابِ دزم ہوں یا وسائلِ بزم، دربار سے متعلق کر و فر ہو یا نادار سے متعلق سیم و زمر، جو آج کی نہیں، ہمیشہ کی دُنیا پرست اقوام کا سرمایہ سرور و غرور رہا ہے اور آج اسی سرور و غرور کو تلبیس آمیز عنوانات سے دین و ایمان اور غلات و اخلاص کا جبار رہا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ دونوں ہی شے بظاہر لایعباد بہ اور انتہائی بے حقیقت ہیں جنہیں مقصودِ زندگی یا دین و ایمان سمجھنا ناعاقبت اندیشی اور ہلاکت کو شفی فرمایا گیا ہے۔

پھر اس بارہ میں قرآن نے محض اصولی ہی دعویٰ نہیں کیا بلکہ واقعات کی شہادت سے جو جگہ اقوام سابقہ کی تباہی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں کہ چند روزہ بھادوں میں پڑ کر وقتی عیش و لذت کے سرور و غرور میں مبتلا ہو کر، تعیش کی افرائش کے لئے داغی کا ڈنوں سے اختراعات و ایجادات میں غرق ہو کر بڑی بڑی جاہر قومیں اُن کی آن میں کس طرح برابگردی گئیں کہ آج ان کا کوئی نام و نشا نہ ملے والا بھی نہیں۔ قومِ نوح طوفان کے تعبیروں سے، قومِ عادِ اندھیوں کے

جھکڑوں سے، قومِ ثمود ہولناک گرج اور غیبی جنگھاڑ سے، قومِ شعیب آسمان کی آتش باری سے، قومِ لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے اُلٹ دیئے جانے سے، قومِ ابراہیم سلبِ نعمت و ملک سے، قومِ فرعون قلمزم کی موجوں سے، اس طرح بے نشان کر دی گئیں کہ نہ اُن پر آسمان رو یا نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹیفک ترقیات، بے نظیر باغات، خوشنما آبشار، سرسبز کیتیاں، دلفریب سینریاں، اسبابِ عیش و نشاط، فرعونِ دمانی کے مجوزہ سرنگ ملک مناسے جن کا مدد سے وہ آسمان کے دروازوں سے قریب ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا، اُن کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونوں کے حق میں موجبِ ہلاکت و تباہی بنیں۔ بالآخر نام اور کلام اگر باقی رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی سادگی و بے تکلفی کا، جسے برقی صاحبِ خالص ملامت قرار دیتے ہیں۔

عاد و ثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فن کاریوں کی بے مثال تعمیرِ ترقی قومِ عاد کو فنِ انجینیری کے تحت نادر روزگار سرنگ ملک، بلند گئیں اور قومِ ثمود کو پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منرل درمنزل تعمیریں اُس عذابِ خداوندی سے نہ بچا سکیں جو نہایت ہی بھادوں میں غرق ہو جانے کے سبب اُن پر آیا۔ اسی لئے قرآن نے اُن کے اُن خالص مادیات کے شاہکاروں اور اخلاق و روحانیت سے بٹے ہوئے کارناموں کو مقصودِ زندگی قرار دے لینے کو نفرت و حقارت سے یاد کیا ہے جس کا مفہوم قطعاً نہیں نکلتا

کہ یہی دنیا داری عین ایمان داری ہے، ورنہ اس ایمان داری کو بے نام و نشان کر دینے اور دُعاوائے عالم باور کرانے کے لئے قرآن کی یہ آیتیں ذاتر تیں بلکہ اُن اقوام کی ان سائنٹیفک ترقیات کو سر لایا جاتا اور عذاب کے بجائے اُن پر انعاماتِ اللہ اترتے۔ قرآن ان کے مناقب بیان کرتا کہ انہوں نے منشاء خداوندی کو پورا کیا اور مسلمانوں کو اُن سے ہٹانے کے بجائے پلایت کرتا کہ وہ ان اقوام کے نقش قدم پر چلیں نہ کہ انبیاء کے، جنہوں نے اُن کی ان ساری ترقیات کو مٹا دینے کے واسطے تیار کئے۔ لیکن قرآن نے بتلایا کہ جب مادی مشاغل اُن کی ایمان داری میں حارج ہوتے اور ان فانی لذات میں پڑ کر ان قوموں نے فرائضِ عبودیت ترک کر دیئے اور انبیاء کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو قہر خداوندی نے انہیں نیست و نابود کر کے دُنیا کو عبرت دلائی کہ اُن کے نقش قدم سے دُور ہی دُور رہیں اور اس راہ پر نہ چلیں۔ پھر قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے اور اس پر سب سے زیادہ عمل پیرا ہونے والی ذات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے۔ آپ نے اس بارہ میں جو عمل نمونہ اور استعمالی اسوہ پیش فرمایا درحقیقت وہی ان آیتوں کا صحیح مفہوم اور سچا مصداق ہے۔ سو آپ نے ان کی سائنٹیفک اختراعات اور مادی لذات کو مقصودِ زندگی سمجھ کر اُن میں ترقی کرنا تو درکنار اُن سے علی الاطلاق فائدہ اٹھانا اور لذت اندوز ہونا بھی گوارہ نہیں فرمایا بلکہ بقدر ضرورت اور وہ بھی با احتیاط ضرورت اور اُس پر بھی بکمال قلت اور اقل قلیل کو بھی محض مصلحتِ دین و دعوامانیت اختیار فرمایا نہ کہ کمالِ ملاحظہ نفس اور پھر اس سے بے تعلقی کا اعلان فرمادیا کہ :-

مالی و ولد دنیا انما انا کہ اکلب | مجھے دُنیا سے کیا تعلق؟ میں تو ایک گھوڑے خیل تحت ظل شجر (۱) | سوار کی مانند ہوں (جو سفر میں ہوا اور دم لینے کے لئے کچھ دیر) ایک درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھ جائے (اور پھر چلتا شروع کر دے) پس دنیا ایک چلتا پھرتا سایہ ہے اور مسافرِ آخرت برائے چندے اثناء سفر میں اُس کے نیچے دم لیتا ہے تاکہ پھر سفر شروع کر دے اور بدستور مقامِ عبودیت پر دسے کرنے میں لگا رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اس پاک ذوق کے ماتحت یہ رہی ہے کہ آپ نے بیتِ نبوت میں بھی ایک سب سے زبردست کام جمع رکھنا گوارا نہیں فرمایا۔ اتفاق سے ایک بار ایک آدمہ دینا دگر میں نہ گیا جو آپ کو عین مغرب کی نماز کی تکبیر ہو جانے پر یاد آیا تو اُسی وقت صلیبت سے ہٹ کر گھر میں تشریف لائے، اُسے صدقہ فرمایا اور پھر اگر نماز شروع فرمائی اور فرمایا کہ بیتِ نبوت کے لئے زبائیں کو اُس پر رات گزرے اور اُس میں سونا چاندی ہو۔ گھر میں مہینوں دُھواں نہیں اُٹھتا تھا اور آپ فقروفاقہ کو بعد شوق و رغبت عزیز رکھتے اور فرماتے :-

اللہم اجعل ال محمد | اے اللہ! محمد کے اہل بیت کا مدنی خیر و نفع قوتاً | یہی ہے جس میں افرامان ہو۔

آپ اُمت کے فقروفاقہ اور ناداری سے خوف نہ کھاتے تھے بلکہ دُنوی قول اور دولت داری سے خائف تھے کہ وہ اُمت کے لئے ہلاکت ہے۔ اُمت کو ہدایت فرماتے کہ اقوامِ عالم پر تمہارا غالبِ زرو مال سے نہ ہو گا بلکہ اخلاقِ محستدی سے

ہوگا۔ جمع مال کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ اُسے بے عقلی کی نشانی فرماتے ہیں۔ حرص مال پر آمادہ نہیں فرماتے بلکہ قناعت پر اُبحار دیتے ہیں۔ بلذخارات کو پسند نہیں فرماتے۔ سست اور بقدر ضرورت عمارت کو جائز رکھتے ہیں۔ کسی کی ادنیٰ عمارت دیکھتے ہیں تو گرائی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں اور عمارت والے آپ کی منشاء کو پا کر اسے منہدم بھی کر دیتے ہیں۔ ازدواجِ مطہرات کے لئے تنگ و تنگ جھروں کی معاشرت پسند فرماتے ہیں جن پر کچھور کے پنوں کی چھت تھی اور مٹی سے اُسے لپ دیا گیا تھا۔ لباسِ فاخرہ کو ماتہ نہیں لگاتے اور کسی کی خاطر کوئی ایسا لباس بدینہ پہنتے بھی ہیں تو گھبرا کر خود اُتار دیتے ہیں اور وہی اپنی پیوند دار کی طلب فرماتے ہیں۔ لذیذ کھانوں سے بے تعلق رہتے ہیں اور تغذیٰ طعام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ عمر بھر کے کھانے کی مقدار میں چند من جو ہیں جن کا کھجوسہ بھی دلوں میں شامل رہتا ہے۔ بچھوٹے کے لئے فرشِ خاک اور اُس پر ایک معمولی کپڑا ڈھکتے ہیں۔ دولت کی افزائش کے لئے احکامِ دگرانیِ نریخ کی اُمید پر مالی تجارت روکے رکھتا، کو روکتے ہیں۔ سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ قمار کو ممنوع فرماتے ہیں۔ لٹا کر کُذرت فرماتے ہیں۔ سیم وند کے برتنوں کو ناجائز فرماتے ہیں۔ دیوار ہائے مکان پر منقش پردوں کی نمائش کو مکروہ جانتے ہیں۔ مادہ لباس (مَد) کو شعار بناتے ہیں اور فیثنوں کی کاشا تروش سے بے تعلق اختیار فرماتے ہیں۔ دُنيا کی ٹیپ ٹاپ تو کبار سے دُنيا ہی کو پسند نہیں فرماتے۔ دُنيا و مایہ کو ملعون فرماتے ہیں۔ دُنيا کو مومن کے لئے جیل خانہ فرماتے ہیں۔ دُنيا کو بے گھروں کا گھرانہ فرماتے ہیں۔ دُنيا کو بغویٰ ملعون

فرماتے ہیں۔ محبتِ دُنيا کو وسیلہ جہنم قرار دیتے ہیں۔

غرض ان تمام وسائل تمدن اور مادہ کی سائنٹیفک ترقیات، ماکولات، مشروبات، مسکونات، طبوسات وغیرہ میں جن کی خدمت اور اختراع واکشاف، کے سلسلہ میں سائنس بے محاشا دُور لگا رہی ہے۔ آپ نے وہ نمونہ عمل پیش فرمایا کہ اُس میں دُنيا طلبی کا مبالغہ تو کبار سے ہی سے دُنيا طلبی کا کوئی نشان یا دُنيا سازی کا کوئی نام یا دُنيا بازی کا کوئی ادنیٰ نقش تک نظر نہیں پڑتا بلکہ تا بعد ضرورت اختیار کرنے میں بھی انتہائی تعلیل، انتہائی احتیاط اور انتہائی بے تعلقی کا اُسوہ سامنے آتا ہے جس سے قرآنِ کریم کی عرصہ کردہ آیات کا مفہوم اور مصداق متعین ہو جاتا ہے کہ منشاء خدوندی یہ دُنيا داری نہیں ہے بلکہ ایمان داری ہے جو اس دُنيا داری کی جذبہ ہے۔ چہ جائیکہ یہ دُنيا داری ہی عین ایمان داری ثابت ہو۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ زندگی سے (جو اعلیٰ ترین عزیمتوں اور بلند ترین ہمتوں کا مجموعہ ہے) نیچے اُتر کر بھی اگر اس دُنيا داری اور اُس کے اُن تمدنی مبالغوں کو شریعت کے عام قواعد پر پرکھا جائے جن میں دُنیوی لحاظ سے توسع اور کافی گنجائش دکھی گئی ہے تاکہ دُنيا کی ہر خدا پرست قوم انہیں اختیار کر سکے تب بھی اس پُوری دنیا کی حیثیت ایک وسیلہ آخرت سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی جس میں ذاتی مقصودیت اور مطلوبیت و محبوبیت کا کوئی شائبہ نہیں نکلتا۔

ادشا و نبوی ہے :-

ان الدنيا خلقت للعبه وانك
خلقت للآخرۃ۔
علاجہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور تم
آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

اس شکل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے یعنی
وسیلہ آخرت ہے، مقصود زندگی نہیں۔ قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے
ہوئے فرمایا :-

وما خلقت الجن والانس
الا ليعبدن۔
”میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف
عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔“

یعنی دنیا اور دنیا داری کی خاطر پیدا نہیں کیا۔ یہی کلمہ حصر کا مضموم ہو سکتا
ہے اور جب دنیا غایت تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلہ عبادت ہونا
ثابت ہوتا ہے۔

ایک موقع پر بذیل دعاستان نبوت پر اس حقیقت کو ظاہر فرمایا گیا۔
ارشادِ نبویؐ ہے :-

اللَّهُمَّ اَعِنِّي عَلَى رَيْحٍ بِالْدُنْيَا
وَحُلِّيْ الْاٰخِرَةَ بِالْقَوَلِ۔
اے اللہ میرے دین کو دنیا کے ذریعہ دے
اور میری آخرت کو پرہیزگاری سے۔

بہر حال ان نصوص سے دنیا وسیلہ دین ثابت ہوتی ہے اور عقلِ اصول ہے
کہ وسائل صرف تکمیل مقامِ مد کے لئے بقدر ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں اگر
وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضیاع مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا
مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں گویا تنہم توکل جائے اور
جوڑ میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تنہم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو شرعاً

ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا ہے اور اس میں کاشت اور کاشتکار دونوں
کی تباہی ہے۔ گویا یہ تمام سامان دنیا بدن کی پرورش اور بقا کا ذریعہ ہے۔
اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ راہِ حق
اور آخرت کی منزل میں طے کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان روح کے
اُس گھوڑے یعنی بدن کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے تاکہ وہ سفر کرنے کے
قابل ہو۔ پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ۔ اس
صورت میں اگر مقصد سفر ہی سامنے نہ ہو تب تو سواری اور گھاس دانہ ہی
کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جس صورت میں مقصد سامنے ہو تو تحصیل
مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ وسیلہ ہی
رہتی ہے مقصد نہیں بن جاتی۔

مادی طاقتوں پر بھروسہ کرنا کی بنیادی علت

اسی کے ساتھ یہ نقطہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ منزل مقصود سامنے
ہو اور سفر کے لئے کوئی دوسرا قریبی وسیلہ یا تھک جائے تو پھر یہ وسیلہ کی
طرف طبعاً التفات باقی نہیں رہتا بلکہ اُسے قریب قریب ترک کیا دیا جاتا ہے۔
غور کیجئے کہ سفر آخرت کی منزل مقصود وصول الی اللہ بلکہ قبول عند اللہ
ہے اس کے لئے حسبِ بیانِ بالا دنیا کے یہ تمام اجزاء مال و جاہ، ہمتیا و اوقار
افراد کے اعداد و شمار اور روٹی و ڈگری وغیرہ وسائل ضروری ہیں مگر وسائل بعیدہ
ہیں، کیونکہ منزل مقصود باطنی و معنی ہے اور یہ اسباب ظاہری اور مادی ہیں،

ظاہر و باطن اور مادہ و روح میں بہر حال یوں بید ہے۔ اس روحانی مقصد کے لئے وسائل قریب جو اسے قریب لے آتے ہیں قوت یقین، تقویٰ، پریہیزگاری، دیانت و امانت، راستبازی، توکل، محبت حق، اتباع طریق انبیاء اور غیر اللہ سے استغناء وغیرہ ہیں۔ یعنی مادی طاقت سبب بید ہے اور اخلاقی طاقت سبب قریب۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کے پاس ان باطنی وسائل کی اخلاقی طاقت مضبوط اور منضبط شکل میں موجود ہو تو اسے قدرتنا مادی اور دنیوی وسائل کی بودی طاقت کی طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اُسے ان وسائل بعیہ کی زیادہ حاجت ہی پڑیگی جبکہ وہ وسائل قریب سے پکنا رہے اور منزلی معقولہ اس سے اُگلی ہے۔

ان دنیوی وسائل کی طاقتوں پر بھروسہ اُسی وقت بڑھتا ہے جبکہ اصل طاقت پاس نہیں ہوتی۔ جیسے کسی شخص کی اصل صحت قائم نہ رہے تو وہ دواؤں کے بل بوتہ پر اپنی صحت کو برقرار رکھنے کی فکر میں ڈوبا ہے اور اسی عارضی صحت ہی کو صحت باد کر کے پر مجبور ہو جائے۔ حالانکہ دواؤں سے حاصل شدہ صحت اصل صحت نہیں بلکہ ایک مستقل روگ ہے جسے یہ بر خود غلط طریقہ مرض سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کے بدن میں اصل صحت راسخ ہو وہ نہ صرف یہ کہ ان دواؤں کو مٹ کر بھی دیکھتا بلکہ ان سے حاصل شدہ عارضی اور سنوئی صحت اور اس کے عمل تحصیل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آج یونپ کے ہاتھ میں اخلاقی طاقت نہیں اس لئے اسے ان مادی وسائل میں غرق ہو کر ان مصنوعی اور سطحی طاقتوں پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے اگر اس کے پاس اخلاقی کی معنوی قوت اور یہ اصل طاقت ہوتی تو وہ یقیناً اس مصنوعی

اور بناؤں طاقت کے فریب میں مبتلا نہ ہوتا دنیا میں اس کے ہاتھ میں مسخر ہوتی اسے جبراً و قہراً مسخر کرنے اور ان آہنی، نفرتی، فلاحی وسائل کے زور سے اُسے دبائے رہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

مسلم قوم کو یہ معنوی طاقت مستند اور مضبوط شکل میں دی گئی تھی اس لئے اس نے اپنے ابتدائی اور بعض درمیانی تعداد میں جبکہ اس کی اصل صحت قائم تھی جتنے بھی تارکینی کارنامے انجام دیئے وہ ان مادی وسائل سے بالاتر اسباب یعنی اسی اخلاقی طاقت کا ثمرہ تھے جس میں نہ افراد کے اعداد و شمار بنیاد کا رستہ نہ سم و دراصل تھا۔ نہ ان چیزوں کا وجود ضروری تھا۔ یہ وسائل بقدر حاجت استغنا کے ساتھ اختیار کر لئے جاتے تھے تاکہ عیدیت و بندگی کی شان ظاہر میں بھی قائم رہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

انکم لن تسعوه باموالکم تم دنیا کی اموال پر اپنے اموال مادی وسائل سے غلبہ دکن تسعوه باخلا فکم۔ نہیں پائے بلکہ اپنے حقوق سے غائب کیے ہو۔

جوں جوں مسلمانوں میں سے یہ اصل صحت و قوت، جو ان کے اسلامی مزاج کے اعتدال سے تعلق رکھتی تھی اور جس کا جامع عنوان فکر آخرت قائم ہوتی گئی، وہ بھی عام دنیا کی طرح اپنی غایت و صحت مندی، آہنی، نفرتی و فلاحی وسائل کی دواؤں میں محو سمجھتے گئے جو حقیقتاً ان کی نہیں بلکہ دوسروں کی طاقت تھی۔

اور لہذا حقیقت وہ طاقت دینی بلکہ بعدت طاقت کمزوری تھی اور وہ بھی چند روزہ ہمار کی مانند، جو بالآخر حرمان و خسران کا باعث تھی۔ کیونکہ بلا فکر آخرت دنیا سے معنی نہ تو دنیا ہی ہے۔ کیونکہ دنیا بہر حال رہنے والی نہیں اور نہ وہ

آخرت ہی ہے۔ کیونکہ آخرت بنانے والے میں مگر ہی نہیں۔ اس لئے دُنیا ہی نہ آخرت بخیر الدنیا والآخرۃ ذلک هو الخیر ان العبدین۔

مگر جب تعالیٰ کے طور پر مسلمانوں نے پانا خراس صنعت ہی کو اپنی طاقت سمجھ لیا اور عام دُنیا والوں کی طرح اس کے پیچھے ہو لئے تو اُن کی بنیاد کھوکھلی ہوئی گئی اور باطل کی یہ دہلی ہوئی اور مصنوعی طاقتیں جنہیں مسلمانوں کی اخلاقی طاقتوں نے دبا رکھا تھا اُن کے مقابلہ پر ابھرے گئیں اور باطل پرستوں نے فرصت پا کر مادی وسائل کا وہی قیصری و کمروی حربہ، یعنی مادی طاقت جسے اسلام کی روحانی اور اخلاقی طاقتوں نے پامال کر رکھا تھا، استعمال کیا اور اُسے ترقی دی اور جب اخلاقی قوتوں سے اس کا معارضہ کرنے والا ہی کوئی نہ رہا تو اس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج کے غافل اور محروم اخلاق مسلمان ان مادی طاقتوں کے پیچھے اس حد تک دب گئے کہ اُن کے ذہن سے اخلاقی قوتوں کے قوت ہونے کا تصور بھی جا ہار ہا، تاکہ وہ اپنی معروبانہ ذہنیت اور ذہنی غلامی سے خود ہی اپنی اُس مردہ قی طاقت پر طعنہ زن ہونے لگے جنہوں نے کل تک ان بنیادی طاقتوں کو معروب کر رکھا تھا۔ آج اُن کے ذہنوں میں فہم کے اُلٹ جانے سے قرآن کا مقصد بھی اسی بنیادی اور مصنوعی طاقت کا حصول محسوس ہونے لگا۔ خلافتِ الہی کے معنی بھی انہی کی مصنوعات میں انہماک و انغماض رہ گئے۔ دینداری اور ایمانداری کا مہدیا بھی یہی دُنیا داری قرار پا گئی۔ منشاء خداوندی بھی یہی سائنٹیفک آلات و وسائل بن گئے۔ پسندیدہ الہی بھی وہی قومیں قرار پائیں جو ان وسائل کی بندگی اور

پابوسی میں سر بسجود ہیں اور مرنی الہی بھی وہی ترقی ہو گئی جو آج ان مادی اقوام کے ہاتھوں ان مادی وسائل کے ذریعہ سلج دُنیا پر نمایاں ہو رہی ہے جس کا حاصل دُنیا کی اقوام پر جبری تغلب و استیلاء کے ذریعہ اقوامِ عالم کو دبانا اور اُنہیں بلبلا ہوا ہونیکو کر تفریحی محشے اور تھقیے لگانا ہے ورنہ اگر ان اقوام کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین مثلاً تہذیبِ نفس، تکمیلِ اخلاق، اصلاحِ علم، خدائی کمالات سے اسکیمالی نفوس، معرفتِ ذات و صفاتِ خداوندی، وصول الی اللہ اور قبولِ عند اللہ، استیلاءِ آخرت، اقامتِ دین، حکمرانیِ قانونِ الہی وغیرہ ہوتا جو کبھی مسلمان کے سامنے تھا تو طبی طور پر تغلب و استیلاء کے ان تباہ کن وسائل اور نفوسِ انسانی کو بلو و لعب اور غفلت میں جھونک دینے والے تفریحی وسائل یا تو درمیان ہی میں نہ آتے یا کسی حد تک دفعِ فتنہ کے لئے آتے تو ان میں مبالغہ و غلو اور مقصودیت کی یہ شان نہ آتی کہ دُنیا کی ساری ہمتا رتیں اور عالم کا ادب ہا ادب دوسرے انسانوں کی تعمیر کے بجائے صرف ان ہی مہمکات کی پیدوار کے لئے وقف ہو اور بالذات یہی چیزیں مقاصدِ حیات کا درجہ حاصل کر کے خلافتِ الہی اور ایمانداری کا لقب پالیں جس سے حقیقی ایمانداری اور خلافتِ حق پیچھے رہ جائے۔

پس قرآن و سنت نے دُنیا کی مذمت کرتے ہوئے اُسے بلا صالتِ مقصود بنالینے اور اس میں مبالغہ و انہماک کرنے سے روکا ہے۔ البتہ بقدرِ ضرورت اور وہ بھی وسیلہٴ آخرت اور خادمِ دین کی حیثیت سے کسب کرتے رہنے کی ہدایت فرماتی جس میں کم و بیش کی تخصیص نہیں کی۔ اگر بغیرِ رت دین

جس کی ان باتوں نے خبر دی ہے اُن میں یہ مطالبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان حکایتوں کے محکی عذر کے مماثل کوئی صنعت بنائیں۔ گویا بندے بھی خدا کی طرح ایک زمین و آسمان تیار کریں یا چاند سورج بنالائیں۔ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ خدا کی ان مختصر العقول عجائبات میں سلامتی لٹکے کے ساتھ تدبیر کر کے بنانے والے کی طرف نیاز مند اند اور معرفت خانہ بدرجہ کر کے اُسے پہچانیں اور یقین کریں کہ یہ مصنوعات وہی بنا سکتا ہے جس کی قدرت لامحدود ہے نہ کہ وہ انسان جس کی قوتیں نہایت محدود اور ضعیف ہیں اور اس طرح بندے اُس کی اس مافوق العادت صلاحیت سے اُس کی خدائی کے قائل اور معرفت نہیں اور اُس کے مستانہ حقوق پہچان کر اُن کی ادائیگی کی فکر کریں۔

پس یہ کائنات آیات قرآنی کے مطلوبہ عمل کی عمل گاہ نہیں بلکہ عارف مزاج انسانوں کے لئے ایک نمونہ گاہ ہے جس میں خود تدبیر کرنے سے قرآن کے نظریات حل ہوتے ہیں اور قرآنی دعاوی کے لئے ایسے تیشیل اور بُرہانی دلائل ہاتھ لگتے ہیں جن سے قرآنی مقاصد بآسانی ذہن میں اُتر جاتے ہیں۔

بالفاظ دیگر قرآن ایک دعویٰ ہے اور کائنات عالم اُس کے لئے ایک عادل گواہ ہے جس کی شہادت سے یہ دعویٰ ثابت اور واجب التسلیم ہو جاتا ہے یعنی قرآن کے دینی معقولات کو اس کائنات کے محسوسات سے تمثیل دے کر بآسانی سمجھا جاسکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شہادت خود مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ مقصود اثبات ثبوت ہوتا ہے جس کے لئے شہادت لائی جاتی ہے جب دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے تو گواہوں کو رخصت کر دیتے ہیں اور ثبات شدہ دعویٰ

بالکل اس قسم کا تمدن اور تمدنی وسائل رکھتا ہوں جو آج کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں تو وہ ضرور حاصل کئے جاویں گے۔ کیونکہ اسلام ان وسائل سے نہیں روکتا۔ بکرا نہیں قبلاً مقصود بنانے سے روکتا ہے۔

پس بالذات مقصود دین ہو گا اور یہ وسائل تفصیل مقصد کے لئے ذرائع ہوں گے نہ کہ خود بذاتہ مطلوب۔ اور ظاہر ہے کہ اس نمونہ سے ہونے تصور کے بعد یہ غلو آمیز ترقی اور اس پر فخر و مباہات کی صورت قدرتنا پیدا ہی نہیں ہوگی پس کہاں ملحدان مغرب کی دنیا پرستی اور اُس پر فخر اور کہاں موحدان اسلام کی خدا پرستی اور دنیا گزاری۔

شہادت بین مشرق و مغرب

ہمیں وہ آیات و روایات جن میں کائنات کی مصنوعات یا تخلیق کے عجائبات اور آسمان زمین وغیرہ کی گونا گوں پیداوار، عناصر و مواد اور ثوابت و سیارات کا تذکرہ فرمایا گیا ہے تو وہ فن سائنس کھلانے اور اُس میں موٹھ گانیاں کر کے صنعت و حرفت کا کاروبار جاری کرنے کے لئے جس آئادہ جی نہیں بلکہ منافع الہی میں دعوت و ترغیب دے کر معرفت خالق کا سرشار لگانے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کائناتی قرآن آسمان زمین برق و جوار، آب و ہوا، عناصر و مواد اور اُن کے افعال و خواص وغیرہ جن کو برق صاحب نے علی قرآن کہا۔ اسے اعلیٰ قرآن کا وہ مطلوبہ عمل نہیں جس کا بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہو کہ وہ قرآن پڑھ کر اس کائناتی صنعت و حرفت کا کاروبار بھیلیں۔ بلکہ یہ قرآن اتارنے والے کا عمل ہے

کو نافذ العمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پس شہادت خود دعویٰ کا عمل نہیں ہوتی بلکہ وسیلہ عمل یا معین عمل ہوتی ہے، محکم اسی طرح محققہ کائنات کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ اللہ کے عبادی اور اُس کی بھیجی ہوئی ہدایات کو اُس کے ذریعہ نظری طور پر سمجھ لیا جائے اور اس تشکیلی بُربان سے معقولات قرآنی کو شہل محسوسات کے یقینی اور قطعی سمجھ کر عقیدہ بنایا جائے اور اُس کے مقتضیٰ کو واجب العمل تصور کیا جائے۔ جب یہ دعویٰ ان حسی دلائل سے ثابت ہو جائے تو اس کائنات سے قطع نظر کر لی جائے اور ان ثابت شدہ ہدایات کی منشاء کے مطابق عملدرآمد جاری کیا جائے۔ پس قرآنی عمل وہ ہوگا جو ان بخوشی آیات کا مقتضیٰ ہو نہ کہ وہ جو ان آیات کا محکی غنہ اور واقعہ ہو۔ کیونکہ وہ محض دلیل ہے نہ کہ ہدایت اور مدعا۔

پس کائنات کی کھود گردید کا مطلب اُس کی نظری اور استدلالی تجزیہ ہے جس سے اثبات مدعا کے مقدمات پیدا ہوں نہ کہ حسی تجزیہ کے کہ جس کی مدد سے غصہ باقی اجزاء کی کھود گردید کر کے اس جیسی کائنات بنائی جاتے اور اُس میں جوڑ توڑ کر کے تمدنی اشیاء کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے تیار کئے جائیں۔ عدالت میں گواہوں کے پیش کئے جانے کا مطلب ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ اُن کے اقوال و شہادات کا تجزیہ کر کے اُن کی بہت کدائی کو سامنے لاکر دعویٰ کی محنت و عدم محنت کا پتہ لگایا جائے نہ یہ کہ ان گواہوں کی بڑی پسلی توڑ کر اُن جیسا ایک پتلا اور تیار کیا جائے یا اُس کے اجزائے ترکیبی میں جوڑ توڑ کر کے مختلف سامان بنائے جائیں جس سے نہ گواہ باقی رہے نہ

دعویٰ۔ پس آیات کائنات ان آیات قرآنی کے لئے دلائل اور گواہ ہیں نہ کہ اُن کا عملی نمونہ یا عمل کا مادہ۔

دوسرے عنوان سے بطور خلاصہ کلام یوں سمجھو کہ قرآن حکیم کی آیتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک انسانی ہیں جن میں کسی چیز کا امر و نہی کیا گیا ہے اور دوسرے اخباری ہیں جن میں ماضی یا مستقبل کے واقعات کی خبریں دی گئی ہیں خواہ وہ افعال عباد سے متعلق ہوں یا افعال رب العباد سے۔ ان دونوں ہی قسم کی آیتوں کا مقصد انسانی کو عملی زندگی کی طرف لانا اور کسب سعادت کی طرف متوجہ کر کے ان دو آیتوں کے تقاضوں پر چلنا ہے۔ برق صاحب تو ان آیات پر چلنے کا مطلب خدا کی نعل اتارنے، اُس جیسا کام کرنے اور اس کی مماثلت کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن کا عمل ہی یہ کائنات ہے جو خدا کا فعل ہے اس لئے لامحالہ قرآن پر عمل کرنے کا مطلب خدا کے مائل کام کرنا ہو جائے گا اور ہم ان آیات پر چلنے کا مطلب اُن کے تقاضوں سے پیدائش و حکام پر عمل پیرا ہونا، اُن کے مطالبوں کو پورا کرنا اور اُن کے مقصدیات کو اُبتاء کرنا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قرآن کا مطالبہ عمل کائنات یا اس کے مادہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا مطلوبہ عمل بندہ کے وہ یا نہ اندازہ اعمال ہیں جو ان آیات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلا مطلب یعنی مماثلت افعال خداوندی ہمارے نزدیک بوجہ مذکورہ صورت باطل ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل بھی ہے جس کی طلب قرآن حکیم عسیٰ فطری کتاب میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حسبِ ذمہ برق صاحب اگر مقتضائے آیات

مگر وہ اس مخلوق ان آیات نگوین سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے لئے جداگانہ مستقل احکام اور حدود ہیں جنہیں شریعت نے اپنے اپنے موقع پر واضح فرمادیا ہے۔

ان آیات کائنات کا حاصل اور تقاضا صرف فکر و تدبیر، مصنوع سے صنائع پر استدلال اور خالق کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کائناتی مادیوں سے انسان صنعت و حرفت کے ذریعہ ضروریات زندگی تمنا کرے کیونکہ یہ خود مامور ہے۔ انکار اس سے ہے کہ ان آیات بخون کا منشاء صنعت و حرفت کی ترقی یا ان کا تجارتی کاویاں پھیلائے، جس کا دعویٰ برق صاحب کر رہے ہیں۔ ان آیات کا حاصل نگوینی دلائل سے معرفت خالق ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جب جگہ مصنوعیات الہیہ اور تخلیق خداوندی کے نمونے زمین، آسمان، بجلی، ہوا، بادل، آگ، حیوان، انسان، مخلوقات نبات اور ان کے طبعی افعال و خواص وغیرہ پیش کر کے ہر جگہ آخر میں صرف یہ کہنے پر قناعت کی گئی ہے کہ ان میں اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ مگر کن کے لئے؟ لقوم یعقلون، لقوم یتفکرون، لقوم یسمعون، لقوم یشکرون، لا ولی الا لہٰد، لا ولی الا اللہ یعنی ان میں نشانیاں ہیں عقلاء کے لئے، مفکروں کے لئے، سمع و طاعت والوں کے لئے، بندہ مغضوں کے لئے، دانش مندوں کے لئے اور ہوش مندوں کے لئے کیونکہ خدا سے باطن کا پتہ لگالینا، صورت سے ماہیت کا سراغ لگالنا اور ہیئت سے حقیقت تک پہنچنا، جانائی عقل، تدبیر، دانش، ہوشمندی، فکر و ساز و ساز و ساز

ساکر شعہ ہو سکتا ہے۔ گو با مادہ کا معنوی تجزیہ کر کے اُس سے علم پیدا کرنا۔ اور وہ بھی علم حقیقت اور حیرت اس سے حقیقۃً اتفاق تک جا پہنچنا بلاشبہ ادنیٰ عقل اور اعلیٰ دانائی ہی کا کام ہے۔ یہی قدرت کی وہ بڑی نشانی ہے جس کو اہل عقل ان بخونیات میں سے نکال لاتے ہیں۔ لیکن مادہ کو تو دھچکڑہ چھری کاٹنے بنالینا، دلی، موٹر چلا لینا، برق و بخار سے لوہے کی کلیں بلا دینا اور مختلف قسم کی صنایع بروئے کار لکر بازاریاں اور دکانوں کو تجارتی مال سے پاٹ دینا اور اُس سے سرمایہ دار بن کر ایشیہ مر وٹے رہنا آخر کون سی ایسی بڑی نشانی تھی جو قرآن کے اُترے بغیر کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی؟ قرآن جب تک نہیں اُترتا تھا جب بھی تو ہر قسم اپنے مناسب حال و مزاج اور ضروریات وقت کے لحاظ سے ان ساری صنعتوں میں ترقی کر رہی تھی۔ عادی و نمود و حیرت کی حیرت ناک مدنیہ کے کارخانے اُن کے بعد کھلنا، قوم ابراہیم کی عیسا کی ترقیات اُن کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے اعلیٰ ترین تمدنی عجائبات، نیز اردو دھرمی اقوام کی تعمیر العقول مادی صنایع قرآن ہی کے بیان کے مطابق اُس کے نازل ہونے سے کہیں پہلے سے موجود تھیں، اُن کا وجود قطعاً قرآن کے نزول پر موقوف نہ تھا۔ بلکہ سرسے سے نبوت پر بھی معلق نہ تھا، بلکہ ایسی ترقیات زیادہ تر اُن اقوام نے کی ہیں جو نبوتوں سے بیزار اور آسمانی کلاموں کا مذاق اڑانے والی تھیں۔ پس یہ تمدنی صنعت گری کون سی اہم چیز تھی کہ اگر قرآن نہ اُترتا تو وہ رومانہ ہوتی؟

کیا برق صاحب اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ یورپ کے ترقی یافتہ

سے عمل زندگی بنانے کا مطلب نہ مماثلت نکلتا ہے نہ تشبیہ بالحق جو برحق سب کا مقصود تھا، تو پھر وہ کونسی عظیم المرتبت چیز ہے جو ان اخباری آیتوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچانی مقصود ہے۔

اگر دل کی گمراہیوں سے غور کیا جائے تو وہ مقصد بجز کسی علمی اور عرفانی مقصد کے کوئی معنی یا ہمتا رقی مقصد نہیں ہو سکتا اور وہ علم و عرفان بھی کائناتی مخلوق یا مواد و عناصر سے متعلق نہیں، کیونکہ اُس کے لئے صرف حیوانی حس کافی ہے کسی علم اثنی یا مثل اثنی کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ وہ علم و عرفان خالق کائنات ہی کی ذات و صفات اور سابق الیہ سے متعلق ہو سکتا ہے کیونکہ نہ اُس سے اعلیٰ کوئی علم ہے نہ اُس سے اونچی کوئی معرفت۔ اور بلاشبہ قرآن ہی کے لئے ذیانتا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُترے اور پوری شد و مد سے قدرت کی ہزاروں جہتی اور معنوی آفاقی اور انفسی نشانیاں دکلا کر انسانوں کو ایسے اچھوتے انداز میں یہ اعلیٰ ترین مقصد سمجھائے جس کی نظر سابق میں نہ ملے تاکہ اُس کے علمی اعجاز اور عرفانی انداز کا آج کی تمدن اور ترقی یافتہ دنیا بھی لوہا مانے بغیر نہ رہ سکے اور خدا کی محنت اس دُور کے انسانوں پر تمام ہو جائے۔

پس ان بخوبی آیات سے وہ حقیقت نظر و فکر اور استدلال کی طرف توجہ کرنا مقصود ہے تاکہ آدمی مخلوق سے خالق کی طرف اور مصنوعات سے مبالغہ عالم کی طرف متوجہ ہو اور ساری کائنات کو آئینہ جمال حق بنا کر اُس کے ذریعہ سے حق اور کمالات حق کا مشاہدہ کرے، اُس کی عظمت اپنے دل میں بھلائے اور اس معرفت کو جو ہر نفس اور صفت قلب و روح کے جب آخرت میں

باشندوں نے یہ بادی ترقی قرآن پڑھ چڑھ کر کی ہے اور کیا انگلستان امریکہ جرمنی اور بابائے وغیرہ کے مشینی کارخانے، سورہ بقرہ اور آل عمران سے مستنبط کئے گئے ہیں کہ آج کے سامان بھی قرآن پڑھ چڑھ کر مشینیکل کا فضائوں کا سبب بنیاد رکھیں اور ان میں بڑھیں چڑھیں؟ آتہ سبحان یوہ پ قرآن ہی کو نہیں سرے سے نبوت ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اگر کوئی اپنے خیال میں کسی مذہب کسی نبی یا کتاب کو ماننا بھی ہے تو صرف ادب اور انشا، یا نظردنکار کی حرکت مگر معاملات میں اُسے کلیتہً ٹھکرائے ہوئے ہے لیکن اُن کی کون سی صنعت و حرفت یا مادی ترقی اس سے بے عمل سے ٹک رہی ہوئے ہے کہ اُن کی ترقیات کو قرآنی عمل پیکار دیا جائے۔

پس قرآن کا ہرزم برق صاحب بڑے شد و مد سے ایسے امور پر توجہ دلاتا جو سرے سے اُس کے وجود و نزول ہی پر موقوف نہ تھے اور ایسے مبتذل علوم لاکر پیش کرنا جو پہلے سے عوام کو معلوم تھے اور ایسی ترقی کو اپنی ترقی کہنا جو اُس کو نہ گذر دینے والی تھیں اُس کے برعکس عمل پیرا ہو کر بھی کہہ ہی میں اور کرتی رہتا ہوں۔ کونسا ایسا عظیم ہذا نہ رہتا کہ قرآن سر آؤ نہ کر کے اُسے عقلاء اور مفکرین کے سامنے بطور آیات قدرت پیش کرتا؟ اس لئے ان آیات قرآنی کی پیروی کے معنی انفعال خداوندی کے ساتھ کسی ارادی مماثلت یا مشابہت کے ثابت ہو ہی نہیں سکتے کہ ان میں ملامت قرآنی کہا جائے، بلکہ یہ تفسیر بالرائے اور ایک ذہنی اختراع ہے جسے قرآن کے سر نہ رہتی تھی چاہا جا رہا ہے۔

وکل یدق حباً للیالیٰ ویلی لا تقرب لہد بذا
پس جبکہ قرآن کی اخباری آیات کی پیروی اور اُس میں چھپی ہوئی نشانیاں

پہنچے تو حقائق اُس کے سامنے عیاں ہوں اور حقیقۃً الحقائق کا عینی مشاہدہ اُسے میسر آجائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات قرآنی کے علوم کا مقتضاء یہ مادی تعارفات نہیں جو غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے اور اسی لئے اس کائنات کو عملی قرآن کہہ دیا گیا۔ بلکہ ان خدائی تعارفات میں غور و فکر کر کے استدلال کے ساتھ معرفتِ خالق کا عقیدہ دل میں جمانا اور معرفتِ نفس کی تکمیل کر کے اُس کی قوتِ عملیہ کو مضبوط بنانا ہے۔ تاکہ وہ اللہ کے اوامر و نواہی والی آیاتوں کی تعمیل کے لئے مستعد اور ہمہ تن شوق بن کر عملی میدان میں آجائے اور اس طرح قوتِ عملیہ کی تکمیل ہو جائے۔

پس یہ آیتیں درحقیقت قلب سے تو اُس عرفانی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام عقیدہ ہے اور قالب سے اُس حسی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام عمل صالح ہے، جو قربِ الہی کے درجات پر انسان کو چڑھاتا ہے۔ یعنی کوئی آیت تو مصنوعاتِ الٰہیہ کو پیش کر کے وجودِ صالح کے عقیدہ کو دلوں میں بدلنا شروع کرنا چاہتی ہے۔ کوئی آیت قدرت کی کچھ نئی نشانیاں دکھا کر اُس کی توحید کا عقیدہ دلوں میں جمانا چاہتی ہے۔ پھر کوئی آیت اُس کا کمالِ معنای پیش کر کے اس کی تنزیہ و تقدیس کا عقیدہ سامنے لاتی ہے۔ اور کوئی آیت اتقانِ صنعت سامنے لاکر اُس کی حمد و ثنا کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہے۔

پس ان آیات کا مقتضاء اور تقاضا کردہ عمل، افعالِ خداوندی کی ثناء یا صنعت و حرمت اور تدبیرِ ایمادات کی ترقی نہیں بلکہ دینی فکر و تدبیر کی ترقی ہے۔ گویا تدبیرِ الٰہیات سے معرفتِ حقائق اور معرفتِ الٰہی تک پہنچنا جو

افعالِ قلوب اور مساعی روح کی ترقی ہے اور پھر ان عرفانی عقیدوں کے تقاضا سے افعالِ عبودیت کی ادائیگی اور عام بدنی عبادات کا بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جو درحقیقت ان عقائد کے آثار اور ثمرات کی ترقی ہے۔

ہاں مگر ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ معرفتِ عقائد میں استقامت اور قوتِ عملیہ کی راستبازی جس میں کبھی اور کبھی کاشائیدہ نہ ہو، بغیر ذہن کی سلامتی اور ذہنیت کی استقامت کے ناممکن ہے۔ پھر اس صحیح معرفت اور علمی قوت کی حقیقی راستی کے بعد بھی عادتِ عمل کا نقشہ اُس وقت تک صحیح اور مطلوبہ انداز پر نہیں آسکتا جب تک کہ کسی عارف کا کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو تاکہ اُسے دیکھ دیکھ کر اور اُس پر تطبیق دے دیکر عمل و عبادت کے وہی نقشہ بنتے رہیں جو مطلوب ہیں۔ بالخصوص جبکہ یہ عمل خدا تک پہنچنے اور اُس کے قرب حاصل کرنے کا ہو تو وہ اُس وقت تک کبھی بھی مطلوبہ نتیجہ پرستوار نہیں ہو سکتا جب تک کہ عمل کا کوئی خدائی نمونہ سامنے نہ ہو جس کی زبانِ طرزِ ادا، لب و لہجہ اور اشارات و غیرہ سے ہم خدا کے قانون اور اُس کی علمی راہروں کو سمجھ سکیں اور جس کے عملی نمونوں کی محسوس ہٹیلٹوں کو ذہن میں جھاکر ہم اُسی انداز سے عمل پیرا ہو سکیں اور اس طرح ہمارا علم تو صحیح ہو کر علمِ نافع بن جائے اور عمل مقبول ہو کر عمل صالح ہو جائے جو منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے قرآن آنا کہ اُس کے تمام علمی و عملی گوشوں کو نمایاں کرنے اور فہم و عمل کی ریح دہنائی کے لئے ذہنِ بابرکاتِ محمدی کو حسی اور علمی نمونہ بنا کر دُنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ آپ کے خالص اور قطعی علم بالقرآن سے ہم سیکھیں

پس جو کتاب اللہ سے آنکھ بند کر کے گا وہ علم و ہدایت سے محروم رہے گا۔
جو کائنات میں تفکر سے آنکھ بند کر کے گا وہ سمودی دلائل سے محروم رہ جائے گا
اور جو اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرب نظر کریگا وہ علم بالقرآن
سے محروم رہ جائے گا۔

بہر حال مساوات و ارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور ان میں غور و فکر
کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفت خالق، معرفت توحید
ذات و صفات اور معرفت توحید افعال۔ سے نفس انسانی کی تکمیل اور اسے
فضائل علم و اخلاق سے آماستہ اور سنبھالنا ہے۔ رمل و تمار فون و
لاسکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں یعنی توحید اور عابد
بنانا ہے۔ انجنیئر، لوہار اور برہمی بنانا نہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ بنانا قرآن پر
موقوف ہے نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت و بصیرت پر۔ البتہ بطور وسیلہ
عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کثرت انگ کر دیا جانا بھی تعویذ
نہیں بلکہ بضرورت عبادت اور بضرورت نفاذ خلافت ان وسائل کی تحصیل
بھی ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ معاش کی طرف سے مملکت سے ہو کر ایک انسان
معاذ کی فکر کر سکے اور قانون الہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج
دینے میں اس کے لئے کوئی مانع یا حیل باقی نہ رہے۔ بالفاظ دیگر وہ اسباب معاش
سے تو اپنے نفس کا مقابلہ کر سکے جو راہ دین میں سب سے بڑا دشمن اور مانع ہے اور
وسائل قوت و شوکت سے فتنہ پردازوں کا مقابلہ کر سکے جو راہ شوکت دین میں
سب سے بڑے خارج اور مانع ہیں اور اس طرح عدائے نفسی اور عدائے اجتماعی

کی دستبرد سے دین اور شوکت دین محفوظ رہے۔

پس یہ مادی وسائل اور تمدنی ایجادات برق و بخار، ریل و تار، مین اورینٹ
موٹر اور جہاز، یا زمانہ کے حسب حال دیگر اسباب نقل و حمل اور اسباب عمل و خبر
جس کی ضرورت میں بھی چل پڑیں گے اور ان پر حیات دنیا و قوت ٹھہرائے گی تو
اسلام بھی انہیں لامالہ اختیار کرنے سے نہیں روکے گا۔ لیکن نہ وہ ان کی ایجاد و
تخلیق کو مقصد زندگی بنائے گا، نہ ان کی تخلیق و ایجاد میں بالا حالت و ذلت، ضرب
کرنا ضروری سمجھے گا۔ البتہ اگر عمل پڑیں گے تو بوجہ وسیلہ انہیں قبول کرے گا لیکن
جب بھی اس کی اخلاق قوتیں بردے گا وہ آجائیں گی تو وہ ان معنوی قوتوں سے
اس کے لئے جھگڑا کرے گا۔

پس اسلامی نقطہ نظر سے نہ تو نظری طور پر ان وسائل کو مقاصد یاد رکھنا
بی جائز نہ کیا گیا ہے اور نہ علی طور پر ان میں ہر گاہ مقاصد غرق اور شغول
ہو جانا بھی وارد کیا گیا ہے۔

اس نوعیت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ جرات نہ ہونی چاہیے کہ مقاصد
عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھوجا۔ نہ اور انہیں ہی مقصد
زندگی سمجھ لیں کہ خلافت الہی کیا جائے۔ کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر
سکتی کہ جس خلافت الہی کے برپا کرنے کے لئے ہزار ہا انبیاء مبعوث ہوئے،
لاکھوں حواری اور صحابہ انبیاء پیدا کئے گئے اور کروڑوں ناظبان انبیاء اور صلوات
ظاہر ہوئے اس خلافت کے معنی لوہے، پتیل، کلاں، اور پتھر وغیرہ کے مختلف
مواد کو سامان ڈھلنے اور ان سامانوں سے اسباب عیش و نشاط یا اسباب

تباہی و بربکت افراط کے ساتھ دنیا کر کے دنیا میں فساد پھانے کے ہیں۔ اگر یہی غلافِ الہی تھی تو معاذ اللہ فرعون مہر، کمرائے فارس، قیصر روم، خاقان چین و اسیان ہند، نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرماہ دار بلکہ تمام دشمنان انبیاء جیسے قادیان اور ہامان، نمرود اور شداد، بوجہل اور بولسب وغیرہ سب سے بڑے خلفائے الہی ثابت ہوتے ہیں۔ یا پھر بڑے بڑے صنائع لوہار بڑی صراف اور سنار وغیرہ خلفائے الہی ثابت ہوں گے اور جب کہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے انھوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت نہ تھی ہے نہ قرآن کی، بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت خارج نکلتی ہے۔ اس لئے کوئی نبی بھی اس ”برقی اصول“ پر خلیفہ الہی باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کوئی بھی ایسا شخص جو ان مادیات کے عشق سے کٹ کر یا د خداوندی میں راسخ القدم ہو، دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہو یا آخرت کے راستے سے دنیا پر قابو پانے کا جذبہ و غل نہ رکھتا ہو، خلافت کی فہرست میں شامل نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ اس نظریہ کے محال شرعی ہونے میں کسی بلیہ سے بلیہ انسان کو بھی تاثر نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ شرعی استعمال معنی اس لئے لازم آیا کہ خلافت کے معنی الٹ دیئے گئے اور اُس کے عنوان کو باقی رکھ کر اُس کے حقیقی مفہوم میں معنوی تحریف کر دی گئی جس سے خلافت کا لفظ تو باقی رہ گیا اور حقیقت گم ہو گئی، اس تلبیس کی انتہائی شکل برق صاحب کے نظریہ پر اب یوں ہو جاتی ہے کہ خلافت کی حقیقت ایمان داری ہے اور ایمان داری کی حقیقت یہ دنیا داری ہے اور دنیا داری کی حقیقت یہ لوہاری اور

نہاری ہے اور لوہاری و نہاری کی حقیقت دوکانداری ہے اور اس دوکانداری کی حقیقت عیاشی اور ظلم کی گرم بازاری ہے۔ لہذا خلافت کے معنی عیاشی اور ظلم و تم کے نکل آتے اور یہ خلافت جبکہ خدا کی ہے اور یہ انسان اُسی کا خلیفہ اور نائب بن کر آیا ہے تو معاذ اللہ یہ عیاشی اور تم رانی آخر میں خدا کا وصفت خاص ثابت ہو جاتی ہے۔ فلا حول ولا قوت الا باللہ۔ کبریت کلامہ تخریج من افواہہم ان یقولون لا اذ کذابا۔

پس کہاں خلافت کے معنی تکمیل انسانیت کے تھے اور کہاں اب تحریف انسانیت کے نکلے۔ یہ سب اُسی ہدف و ذریعہ کا نتیجہ ہے کہ جو تزکیہ سے الگ رہ کر محض الفاظِ قرآن سے اُس کے معنی ماہوار نفس سے اختراع کر لئے گئے۔ اُن ہی کو مردِ ربانی سمجھ لیا گیا ہے اور دین کو الہامی رکھنے کے بجائے اختراعی قرار دے لیا گیا تاکہ اس کی تعبیرات کو باقی رکھ کر اندازہ تلبیس اُس کے معانی میں من مانے تفرقات کے دلستے کھلے دیں اور اس طرح مسلمانوں کو الفاظِ قرآنی سن کر بآسانی جال میں پھانسا جاسکے۔

میرزا جس خلافتِ الہی کے لفظ کو ہاتھ میں لے کر یہ تہارت، مصنعت اور ترقی ترقی اُس کے مفہوم میں شامل کی گئی بلکہ تنہا اُسی کو اُس کا صحیح مفہوم قرار دیدیا گیا اُس کی حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی تاہم اس کی ضرورت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ بحث و تنقید سے الگ ہو کر تحقیق کی نگاہ سے بھی اس مسئلہ کو دیکھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اگر خلافت اور ایمان داری کے وہ معنی نہیں اور یقیناً نہیں کہ جن کو برق صاحب نے اختیار کیا ہے تو اس کے صلی مشن کیا ہیں؟ اور اگر یہ تہائی عبارت

معیارِ خلافت و استخلاف

[illegible]

اس لئے خدا نے بڑے درویش کا فیاض رہی ہو کتاب ہے جو خدا کی اوصاف و
امانات کا پرتو پیش اندھ لٹے ہوئے، بڑے اُس سے متاثر ہو۔ اُن کا یہ انوشہ ہیں
کہ پردہ دنیا پر خود راہ ہو اور پوری طرح اُس کا اطاعت شمار ہو کہ اُس کی
خیرات پر غلہ پیرا ہو۔ نہ کہ وہ بڑا اُس کے اوصاف، درمات سے قطعاً
مناشیہ یا اُن کی نسبت سے نااہل اور یا اُن اوصاف و اذنان کی ہم آہنگ
محبت میں جا رہا ہو اور اُسے اطاعت و انقیاد سے کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ
بہر ان اذنان پر تکیا ہو۔

اور مادہ کو توڑ پھوڑ کر مختلف اشیا ر بنانا یا عناصر کائنات کو سخر کرنا ہواؤں میں اڑنا اور ایجاد و اختراع سے مادی عالم کو قابو میں لے کر خلافتِ الہی نہیں تو کیا پھر خلافت کے معنی بقول برق صاحب اُسی کو دري ملائیت کے نہیں رہ جاتے جس کے نیچے بقول موصون منسلاتے قدرت سے نافذ تھی، انسانی اور آفاقی وسائل سے بے خبری اور انجام کا بے بسی اور بے حسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟ اس لئے نہیں چاہتا ہوں کہ خلافتِ الہی کی نوعیت پر ایسے انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ تخریر کائنات کی وہ نوعیت بھی روشن ہو جائے جو قرآن نے انسان سے طلب کی ہے اور خلافت کا حقیقی مفہوم، نیز عبادت و بندگی یا دیانت کے فرائض کا تعلق بھی اس تخریرِ عالم سے واضح ہو جائے جو اساسِ خلافت کی حیثیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی جن تین قرآنیوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اُن کے عرض کردہ موضوع اور مفہوم کی نوعیت بھی تحقیق رنگ میں کھل جائے۔

قرآن کا مقصد وحید تکمیل خلافت ہے

سو حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد وحید انسان کو اس کی حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جبکہ کمال کا حقیقی معنی ششم ذات خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے اوصاف و افعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد و قابلیت جو ہر نفس بنالینا ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور اس تقریباً استکمال ہی سے ذرا کی نابت و غلظت کا استحقاق خصوصی طور پر انسان کے لئے ثابت ہوتا

کمالاتِ خداوندی کی تین نوعیں

ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے وہ نام و کمالات جن کے اقتباس سے آدمی نیا بنی اللہ تعالیٰ پر آتا ہے اولی نقطہ نظر سے تین نوعوں میں مخیر نظر آتے ہیں:-
 کمالاتِ علم و ادراک، کمالاتِ وصفت و اخلاق اور کمالاتِ صفت و افعال۔
 پہلا نقطہ کتاب زہدیت میں جس قدر بھی اساء و ذات اسم یا افعال کی صورت سے ذکر فرمائے گئے ہیں وہ سب ان ہی تین انواعِ کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں اور اگر اساء میں جن سے اللہ کے علمی کمالات پر روشنی پڑتا ہے بیت
 "یا مہر ذبیحہ سبیل و بصیر، حدیث و واحد و غیرہ۔ یا وہ افلاک اساء
 ہیں جن سے اس کے جبرہری اخلاق اور پاکیزہ و طہیت تو اسے باطن پر روشنی
 پڑتی ہے جیسے صبور و شکور، سہولت و دشواری، سہیجہ و کرمیہ، معبود و معبود
 اور قوی و مستن و غیرہ۔ یا افعال اور صفات اساء ہیں جن سے اس کے صنعتی
 کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے خالق و باری، بدیع و معصور، مبدع و
 معید، محیی و ممیت، نافع و ضار اور سائر مفعلی و غیرہ۔ جیسے انار
 کے سب یا ان ہی تین کے: تعلقات اور باری و آد میں سے ہیں یا انفس
 ذات کے پورہ دائرہ میں۔

قرآن کریم نے اصولی اور فنی طور پر ان تینوں کمالات کا حقیقی مزہ چمکاتا ہے ان
 کو بتاتے ہوئے اسارت پر مبنی پر اس کے ان ہی تین کمالات کا ادا کا نام
 ثابت فرمایا ہے۔ کمالاتِ علم و ادراک کے احاطہ نام کے بارہ بیاد شاد ہے:-

زَاتِ اللّٰہِ تَعَالٰی خَاطِرُ مَکَلٍ شَیْءٍ عِلْمًا۔
 اور اللہ ہر چیز کو احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

کمالاتِ وصفت، اخلاق کی اصل۔ صفت رحمت تھی جو جمالی اخلاق کا سرچشمہ
 اور بلائی اخلاق کا سرمنشاء ہے اور جس کی ہمہ گیری گویا تمام اخلاق کمال کی ہمہ گیری
 ہے اس کے احاطہ عام کے بارہ میں ہے:-

و رحمتی وسعت کل شئ۔ اور میری رحمت تمام چیزوں کو گریہ کرتے ہے۔
 کمالاتِ صنعت و افعال کے احاطہ عام کے بارہ میں فرمایا:-

صَنَعَ اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْفَعُ سَکَلٍ یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو سب
 شئ۔ اندازہ پر مضبوط بنا رکھا ہے۔

غرض کمالاتِ ربانی کی یہی تین اصولی انواع ہیں جو تمام برکات و مہزرات کا
 سرچشمہ ہیں اس لئے قدرتی بات ہے کہ انسان اللہ کا نائب یا خلیفہ اس وقت
 تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سرگاہ کمالات میں اسی کے طرز کمال کا نمونہ بن کر
 نہ دکھائے اور ان کمالاتِ علم و ادراک، کمالاتِ وصفت و اخلاق اور کمالات
 صنعت و افعال کی روشنی اپنے اندر جذب کر کے اسی انداز سے نہ پھیلائے تو
 اندازہ افادہ خود اس خداوندِ جلال و الامرام کا ہے۔

بِشْتِ اَنْبِیَاءِ کَا مَقْصِدِ اَنْ ہِیَ کَمَا لَسَہُ کَاہِ کَا تَرْوِجُ وَ تَکْمِلُ ہِیَ

چونکہ انبیاء علیہم السلام اولین خلفائے الہی ہیں اس لئے ان کی بشت
 کی غرض و غایت ان ہی تین کمالات "علم و خلق و صنعت" سے بنی آدم کو آشنا بنانا

اور علی طور پر اس راہ چلنا ہے تاکہ انسان خلیفہ الہی بن کر اپنے منیب کی مشائخہ کے مطابق ان ہی تینوں کمالات کی روشنی میں اس کمالات کا انتظام کرے اور مالک کمالات کی مرضی پر خود عمل کر اس کی راہ کو چلائے۔

انہی لئے سربراہ انبیاء و محمد رسول اللہ علیہ السلام نے اپنی بعثت کی غرض و غایت ان ہی تین کمالات کی ترویج و اشاعت ظاہر فرمائی چنانچہ علی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا و ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ :-

انما بعثت معلما

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا :-

بعثت لاقعہ

لا تعلو

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

علی اور حضرت کمالات کے غرض بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعت

شرعیہ کی ترویج کو غرض بعثت ظاہر فرمایا جو ہر نوع کی حکمت علی یعنی تمدنی،

منزلی، مدنی، عمرانی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور حضری وغیرہ افعال کے فطری

احول پر مشتمل ہے اور جس کے مجہول کا نام شریعت ہے :-

بعثت الخفیۃ السہلۃ

میں پائی ہوئی سیدھی، سہل

روش اور رعایتوں پر مشتمل شریعت

دے کر

قرآن حکیم نے ان تینوں مقاصد بعثت کو ایک مختصر آیت میں عبادی معیت

کے ساتھ جمع فرما کر اعلان فرمایا کہ :-

لما اذبح بعثت فی

انما بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

میں بھیجی گیا جو علم بنا کر

تربی اخلاقی کی تکمیل کروں

بعثت لاقعہ

دہی ہے جس نے (عرب کے) ناخوار

لوگوں میں ان کا رک قوم، جس نے (یعنی

عرب میں ہے) ایک پیغمبر بھیجی جو ان کو اللہ کی

آیتیں پڑھ کر سکاتے ہیں اور ان کو (وفاقی

باطل و اخلاق و فطرت سے) پاک کرتے ہیں اور ان

کو کتاب اور دانشدہی (رکباتیں) سکھاتے ہیں

اس آیت میں بعثت کی ایک غرض تلاوت و تعلیم آیات بتلائی گئی جو کمالات

علم کی تکمیل ہے۔ بعثت کی دوسری غرض ترویج نفوس ظاہر فرمائی گئی جو کمالات

اخلاقی کی تکمیل ہے۔ بعثت کی تیسری غرض تعلیم حکمت فرمائی گئی جو رسوخ و

یعنی حکمت علمی کے ذریعہ کمالات عمل کی تکمیل ہے۔ رکیو کو حکمت کے معنی

حسب تفسیر علی علیہ السلام علم نافع اور علم صالح کے ہیں جو یہ کہ ان تیسہ

نفل کا ہے اور علم نافع جو تلاوت آیات میں آگیا تو آگے علم صالح ہی حکمت

کے مفہوم میں باقی نہ جاتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے حکمت کی تفسیر علی

تکمیل ہی سے کی ہے۔

پس یہ آیت اس طرح تین حکمتوں، حکمت علمی، حکمت اخلاقی اور حکمت

عمل پر مشتمل تھی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک تمام انبیاء

سے دنیا میں بھیجے جانے کی غرض و غایت ان ہی تین حکمتوں اور کمالات کی علمی

تشریح، اخلاقی تعلیم اور علمی تکمیل ہے جو اس میں خلافت ہیں۔

۲۰

کلماتِ سہ گانہ کی نوعیت

ہاں پھر یہی ظاہر ہے کہ بسلسلہ منصبِ خلافت ان ہر سہ کلمات میں تشبیہ بالخلق کی منزلیں طے کرنے کے لئے ان کلماتِ الہیہ کی وہی نوعیت اختیار کرنی پڑے گی جو خود اُس سرچشہ کلمات کے سہاں اُن کی فطری نوعیت ہے تاکہ اُسی نوعیت کا علم وخلق اور حسن وعلیہم پہنچ کر حقیقی معنی میں خلافت کا ثبوت فراہم ہو جائے اور اُس کی ضرورت نہ پڑے کہ کلمات کا شرعی لفظ انتہا کر کے اُس میں معنی اپنی طرف سے ڈالے جائیں اور حقیقی کے بجائے مضموضی خلافت رہ جائے حقیقت تبلیس کے سوا کچھ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ کلماتِ الہیہ کی وہ اولین اصولی نوعیت جو ان میں بطور قدرِ مشترک یکساں طور پر پائی جاتی ہے غنائے کامل ہے جس میں غیر کی محتاجی کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں۔ چنانچہ علمِ الہی کی پہلی اور آخری شان یہ ہے کہ وہ وسائل اور وسائل کا محتاج نہیں، وہ کسی کی بلکہ خود اپنا ہے، وہ استدلالِ لیس بلکہ ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل اور شاید وغیب سب اُس کے سامنے بطورِ علمِ ضروری کے موجود حاضر ہیں۔ اُسے حصولِ علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے کیونکہ یہ جبل کی علامت ہے اور وہ جبل سے بری و بالا ہے۔ اُسے نفع و تخمین سے تعلق تک پہنچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ لامعی کا ملب ہے اور وہ ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہے۔ اُسے کمالات سے پڑھ کر اور استادوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ ذاتِ کلمات

سے نُقلو اور تکمال سے ہے جو سراسر محتاجیِ غیر ہے اور وہ نُقلو اور احتیاج سے بری ہے۔ اُسے حقائق تک پہنچنے کے لئے صورتوں، شکلوں اور محسوس ہیتوں کی حاجت نہیں کیونکہ یہ علم بالواسطہ ہے اور وہ واسطہ کی محتاجی سے بری ہے۔ غرض علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسبابِ علم سے غنائے مطلق ہے اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج، ہیئت ہو یا حقیقت صورت ہو یا ہیئت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں۔ نہ اُن کے اوّل میں غیر کی محتاجی ہے نہ آخر میں۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں، کیونکہ وہ خود ہی ہر چیز کا اوّل ہے اور خود ہی آخر خود ہی ظاہر ہے اور خود ہی باطن، ہوا و لا ولی لیس قبلہ شئی و هو الآخر لیس بعدہ شئی و هو الظاہر لیس فوقہ شئی و هو الباطن لیس دونہ شئی اس لئے علمِ الہی کی اس غنائے مطلقِ مٹھم جاتی ہے۔ چنانچہ علم کے دائرہ میں اللہ کے حقیقی خلفاء وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنائے کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب و اکتساب اور بلا واسطہ کتاب و استاد نیز بلا ریاضت و کمایہ و جہد اور الہامی طور پر براہِ راست اللہ سے اُس کا علم پائیں جس کا نام علمِ لدنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے اور یا پھر کسب و ریاضت بھی اگر ہو تو انبیاء ہی کے تعلیم کردہ اصول و طرق اور اُن ہی کے پیش کردہ اُسوہ کے مطابق جن پر چل کر یہ علم اگرچہ ابتدا و تکسب اور حصولی کملائے مگر آخر کار علمِ الہی سے ایک نسبت پیدا کر کے وہی بن جائے اور خود قلبِ صافی ہی میں سے علم کا چشمہ چھوٹ نکلتا جس میں وہی تباہ غنا، آجائے کہ نہ اس میں کسی واسطہ کی احتیاج باقی رہے، نہ کتاب و استاد اور دوسرے وسائلِ تعلیم کی حاجت رہے جو

اویسے اُمت، اُمر ملت اور صلئے قوم کی شان ہے۔

یعنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معبد و اوستا

ہاں پھر علم ہی کی طرح یہی صورت اخلاقِ دینی کی بھی ہے کہ اُن کا منتہا بھی درحقیقت یہی غنائے کامل ہے جو اس اخلاقی خلافت کی اساس ہے۔ یعنی ہر خلقِ حسن کی روحِ آخر میں یہی غنا اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر ہر خلعتی کی روحِ انجام کا مدحتا جی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضعِ باند کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم دیکھی جاہ اور خودی سے کٹا دم کش اور بے نیاز ہیں بکاف و قناعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم مال و منال کی محبت و طلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں۔ صبر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں، شکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اس نعمت سے اگے ہوئے نہیں بلکہ منعم سے وابستہ ہیں جو ہر چشمہ غنا ہے۔ شجاعت کے معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں۔ حیا کے معنی ہی حق کی خاطر مغایاتِ نفس سے بے پرواہ ہو جانے کے ہیں۔ ایثار کے معنی ہی دوسرے کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دستبردار اور بے نیاز نہ ہو جانے کے ہیں۔ حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور عذابِ انتقام سے بالاتر ہو جانے کے ہیں۔ عفو و درگزر کے معنی ہی حق کی خاطر سزا و جزا سے بے نیازی ہوتے ہیں۔

غرض ہر خلقِ حسن کی روحِ آخر میں غنا اور غیر محتاجی نکلتی ہے کہیں اپنے سے کہیں دوسرے سے، کہیں اپنے حقوق سے، کہیں دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے اور اس کے بالمقابل اخلاقِ حسنہ کی امداد یعنی ہر ہر خلق کی بنیاد جبلی

خود پر محتاجی اور غیر کی اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضع کے مقابلہ میں تعلی کے معنی غیر پر اپنا تفوق جتانے کے ہیں جو سر اسر غیر کی محتاجی ہے۔ کیونکہ غیر نہ ہو تو تفوق کس پر جتا یا جائے؟ لہذا غیر کی محتاجی ہوتی۔ پھر وہ ہمیں اپنے سے فائق خیال نہ کرے تو یہ تعلی کا سیاب کیسے ہو؟ لہذا غیر کے خیال تکس کی محتاجی ہوتی۔ اس لئے تعلی اور شیخی سر تا پایا احتیاج غیر نکلتی ہے جو ہمیں دوسرے کا امیر اور قیدی بنادیتی ہے جسے ہم غلط فہمی سے عزت تصور کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ انتہائی ذلت اور ذلتوں کی جڑ بنیاد ہے۔ یا مثلاً سخاوت کے مقابلہ میں پھل کے معنی مالی محتاجی کے ہیں نہ کہ اُس سے غمی اور آفاذ ہو جانے کے۔ بے صبری اور جزعِ فزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اُس کے غم میں گھل جانے کے ہیں کہ اُس کے بغیر چین و قرار نہیں۔ اگر اُس سے غمی ہوتے تو یہ بے صبری کیوں ہوتی؟ یہی اُس کی محتاجی اور غلامی ہے۔ عین و بُردلی کے معنی مقابل کی صورت سے متاثر ہو کر اس کی طاقت سے دُب جانے کے ہیں اور تاثر ہی محتاجی ہے۔ ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی سرِ چشمہ نعمت یعنی منعم سے کٹ کر خود اپنے بے نعمت نفس کی اسیری اور غلامی کے ہیں جو خود بذاتِ اس نعمت سے محروم تھا ورنہ دوسرے سے نعمت کا خواہاں اور حاصل کنندہ کیوں ہوتا؟ اور محرومی و غلبہ یا عطا نے غیر کی احتیاج ہی غیر کی اسیری ہے جو سر تا سر ذلتِ نفس ہے۔ حرص کے معنی دولت اور اسبابِ شہوت کی محتاجی کے ہیں۔ بے حیائی اور فحش کے معنی عقل و شریع سے الگ ہو کر خواہشِ نفس کی پیروی کے ہیں اور نفس بالبطع جاہل اور بے تمیز ہے۔ اگر سرِ چشمہ جمالت کی محتاجی اور اسیری کے ہیں جو بہت بڑی ذلت ہے۔

غرض ہر خدائے ہمت جگہ غیر اور ذلت کی ہر جگہ اور ہر نیک فتنے فتنے نفس، عزت، خودی اور وقار و خود داری کی اساس ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ کی ذات باہر کائنات تمام اخلاقی خستہ کا سرچشمہ اور معدن ہے نو غنائے مطلق اور صمدیت کا سرچشمہ ہی وہی ہو سکتا ہے اور اس کا یہ غنا بہن اس کی ذات لامحدود کی طرح لامحدود ہی ہو گا۔ یعنی بے نیازی سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک چیز سے ہوگی، کائنات اور کائنات کے سارے وسائل سے ہوگی اسی لئے اس نے اپنی شان خود ہی ارشاد فرمائی کہ:-

وَرَبُّنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ (اور بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے بے پروا ہے) یعنی وہ کسی چیز سے الگ ہوا نہیں۔ اسی لئے اس کی عزت اور اس کا اقتدار بھی جہانوں کے ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے اور اسی لئے اس نے اپنا نام صمد بتلایا ہے جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے ہی محتاج ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ اخلاقی کے سلسلہ میں اللہ کا نائب اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو ان اخلاقی الصبر و شکر جو دو کرم، رافت و رحمت، محبت حق، قوت و متانت وغیرہ سے متصف ہو کر سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک چیز سے بے نیاز اور غنی بن جائے اور بالفاظ مختصر اپنے خالق کی فتنائے کامل کا مظہر اتم بن کر اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے۔ بے نیازی، بے لوثی اور استغنائے کلی اس نے چہرے، اہرے، اس کی ہر حرکت و سکون اور اس کے اقوال و افعال سے ایسا ہوا اور اس فتنائے کامل سے اس کا باطن اور اندرون مطمئن،

منشرح اور آسودہ ہو کر ہر غیر سے آزاد ہو جائے۔ نہ اس کی عزت و جاہ کسی خیال پر موقوف ہو۔ نہ اس کا حظ و نصیب کسی غیر کی عنایت پر مشفق ہو۔ نہ اس کے بسط و انبساط اور فرح و سرور وغیرہ کسی غیر سے ملے ہوئے ہوں جن کے زوال کا فطرہ اسے فکر مند بنا کر اسے غیر کا اسیر بنا دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقی خلافت بھی آخر کار اسی غنائے نفس پر قائم نکلی، جس پر غلی خلافت کی تعمیر کھڑی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ جب انسان ان غفیری وسائل اور مادی حواج سے تلبا مستغنی ہوئے بغیر خداوندی اخلاق کے غنا کا ابتدائی نمونہ بھی قائم نہیں کر سکتا جو اخلاقی خلافت کے لئے خشتِ اول ہے تو نا ممکن ہے کہ وہ خدائے برتر کی اخلاقی خلافت کا متحنی ٹھہر جائے اور اس میں ان اخلاقی ربانی کے نور سے ہر غیر اللہ سے قلبی استفادہ کا ظہور نہ ہو اور وہ اخلاقی طور پر محبت جگتی غیر کی ان دلدادوں سے باہر نہ نکل آئے جن کی ابھی سزوری تفصیلاً عرض کی گئی۔ اب خواہ یہ غیر اللہ جہاں و بحار ہوں یا برق و سحاب، آب و آتش ہوں یا خاک و باد۔ پھر ان کے موالید ثلاثہ جمادات نباتات حیوانات ہوں یا اجناس خمسہ پس کہاں ان مادیات کی غلامی و اسیری میں بند رہ کر اس غلامی پر فخر کر نہ والے اور کہاں خلافتِ الہی جس کے معنی ہی ان اشیاء سے آزادی، خیر محتاجی اور غلامی شکنی کے ہیں۔ شان بین مشرق و مغرب۔

ہاں پھر اسی طرح جو نوعیت علم و اخلاقِ الہی اور ان کی خلافت کی ہے، وہی بعینہ خدا کی صنعت و ایجاد اور فتائی کی بھی ہے کیونکہ اس کی اساس بھی یہی شانائے کامل اور غیر محتاجی غیر ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی فعل، اس کی

کوئی صنعت نہ وسائل کی محتاج ہے نہ اسباب کے تابع ہے، وہ خود ہی سبب و سبب ہے اور خود ہی مسئول الوسائل ہے۔ تمام افعال کو اسی کی باطنی قوت نمایاں کرتی ہے جس میں نہ مادہ درکار ہوتا ہے نہ مدت۔ خود اسی کی باطنی طاقت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے جس کے لئے یہ اسباب و مستببات کا سلسلہ ضروری نہیں۔ بلکہ صرف کن فیکون کی لامحدود طاقت سے یہ افعال بروئے کار آتے ہیں اور اگر اس ظاہری عالم میں اُس کے افعال بذیل اسباب بھی نمایاں ہوتے ہیں تو خود اسباب کا وجود بھی فوری اور آبی طور پر اُن کی فیکون کی قوت سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

غرض افعال خداوندی میں اسباب و مستببات کا سلسلہ یا مادہ و مدت کا علاقہ یا زمان و مکان کا رابطہ کسی محتاجی کے سبب سے نہیں بلکہ حکمت کے تحت ہے جو مخلوق کے ضعیف نفوس کی تسلی اور سہولت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اُن کی تخلیق و ایجاد سے ہے ورنہ قدرت مطلقہ کو ان سلسلوں کی قطعاً حاجت نہیں، اسی لئے خوارق عادت یعنی معجزات یا کرامات یا ارباب صاوت یا قوی غیر معمولی حوادث کا باب قائم کر کے اور ہر کئیہ میں مستثنیات رکھ کر نیز ہر دائرہ میں اختلاف و تضاد ڈال کر قدرت مطلقہ اور غیر محتاجی و وسائل کا کھلا عملی اعلان بھی فرما دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب صنائع خداوندی کی اصل شان و وسائل سے غنا رہے اور اختیاد و وسائل محض حکمت و مصلحت کے لئے ہے اور وہ بھی ایجاد و وسائل کے ساتھ نہ کہ محض استعمال و وسائل کے ساتھ تو انسان کو کبھی حقیقی طور پر صنعتی خلافت اُس وقت تک میسر نہیں آ سکتی جب تک کہ اُس کے

مفہم و عمل کی قوتیں بھی اسباب و مستببات اور زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہو کر اُن کی فیکون کی انداز کی نہ ہو جائیں جیسی خود اُس مائع عالم کی ہیں۔ نیز حقیقی معنی میں انسان اُس وقت تک نا شب صنعت و فعال قرار نہیں پاسکتا، جب تک کہ ان وسائل ظاہری سے اُسے ایسا غنا و میسر نہ آجائے کہ مادہ و مدت اُس کے کاموں میں کوئی توقف پیدا کر نہ سکیں اور وہ اپنے صن و عمل میں کسی غیر ارادہ کا محتاج نہ رہے خواہ وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص و اعیان عناصر و موالید ہوں یا فلکیات و ارضیات، یہ تمام اشیاء نہ اُس کی صنعت میں حارج ہو سکیں نہ اُس کی کسی صنعت کا موقوف علیہ بن سکیں۔ وہ چاہے تو بلا وسائل پر واز محض خدا کی طاقت کے مجبور و اور اپنی قوت یقین سے آسمانوں تک پرواز کر سکے اور چاہے تو بلا وسائل برصد گاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچا دے۔ وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسلکی اپنی صدا مشرق سے مغرب تک پہنچا دے اور چاہے تو فرش زمین پر بیٹھ کر فرش ہی کی نہیں عرش کی خبر سن لے آئے وغیرہ۔

غرض اُس کی ہر صنعت و کار گزار ہی خود اُن کی قوت متخیلہ و تصور کے تابع ہو جائے کہ جو دھیان باندھ لے وہ واقعہ بن کر سامنے آجائے۔ گویا یا خارجی عالم اُس کا ایک خیال بن جائے کہ اُس کی خیالی جنبش اجزائے عالم کو جنبش میں لے آئے۔ یعنی وہ اپنے کام میں باہر کا تابع نہ رہے بلکہ ہر بیرون اُس کے اندر کا تابع ہو جائے جس کا حاصل وہی کمال غنا و تکلف ہے جس سے نفس ہی اپنی معنوی قوت سے بڑے بڑے افعال بروئے کار لا سکے جس میں کسی مادی وسیلہ کی محتاجی نہ رہے۔ یہ جذبات ہے کہ ایسا قوتی المعنویت بندہ اپنی شان

عبدیت نمایاں رکھنے کے لئے اس غناء کا مظاہرہ نہ کرے اور پیش حق باذن حق اپنی شانِ ادب قائم رکھنے کے لئے عوام کی طرح اسباب و وسائل کا پابند نہ رہے اور جب بھی اس قوت کو کام میں لائے تو یامائے حق استعمال کرے تاکہ اس غناء کے ساتھ بھی اللہ کے سامنے اُس کی محتاجگی اور بندگی غیر مشتبہ و پرپیش ہوتی رہے لیکن ظاہر ہے کہ صنعتی خلافت کا یہ اعلیٰ ترین مقام کہ صنعت و کسب میں اعتقاد و عملاً اسباب و وسائل کی حاجت باقی نہ رہے اور صرف ادب و اتباعِ اہی انہیں اختیار کیا جائے یقیناً کالمین کا حق ہے، مگر اس خلافت کا وہ مقام جو ہر قابلِ خلافت مومن کے لئے ضروری ہے۔ یہ ہے کہ اگر وہ عملاً اسباب و وسائل سے مستغنی نہیں تو کم از کم اعتقاد اُن کی محتاجگی کے دلدل سے نکلا ہوا ہو۔ یعنی اگر ہاتھ پیر اسباب سے بے نیاز نہ ہوں تو کم از کم دل بے نیاز ہو اور اُس میں یہ یقین صادق و مجرب ہو کہ اسباب و وسائل محض حیلے ہیں جو طفلِ تسلی کے طور پر ہمارے صنعتی یقینِ نفوس کے سہارے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں جن میں بذاتِ کوئی ادنیٰ تاثیر نہیں۔ مگر حقیقی صرتِ حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ بابرکات ہے۔

پس ایسے خلفاء میں اگر ترکِ اسباب سے صنعت گری کی قوت نہیں تو دل سے اعتقاد رکھنے کی قوت بہر حال موجود ہوتی ہے جو اُن کے ظاہر کو نہیں تو کم از کم باطن کو ضرور مستغنی رکھتی ہے اور اگر ظاہری خلافت اُن کے حق میں نہ آئے تو باطنی خلافت اُن کا نصیب بن جاتی ہے۔ البتہ الخلفاء ہر مَنوالِ الہیوں کے اصول پر اُن کی عملی زندگی اس اعتقاد کا رنگ لئے بغیر نہیں رہتی اور وہ اسباب

طبیعیہ کی طرف اگر جھکے بھی ہیں تو کسی شغف و انہماک یا اس محتاجگی پر فخر و مباہات کے جذبات کے ساتھ نہیں بلکہ اَجْبَلُوا اِنِّیْ اسْطَلَبْتُ وَاَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ ذِیْ الرَّحْمٰنِ میں اس علیٰ طلب اور افتیاءِ اسباب پر بقدرِ ضرورت ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ دل اُن کا غنی رہتا ہے۔ البتہ اُن کے اس علیٰ و اعتقادِ استغناء کی بدولت یہ وسائل و اسباب سے بے نیازی کا ذخیرہ نفس میں تدریجاً جمع ہوتا رہتا ہے اور آخرت میں ایک دم یکجا ہو کر بالا خُراں میں بھی وہی کُنْ نِیکُوْکُنْیٰ شان پیدا کر دے گا۔ اور اُن کی باطنی قوت غنا قوتِ تمکین پر اس درجہ حاوی ہو جائے گی کہ وہ جو خیال باندھ لیں گے وہی مشکل ہو کر سامنے آجائے گا اور جو چاہیں گے وہ بلا توسطِ اسباب اچانک ہو جائے گا۔ پس یہ دنیا کی خلافتِ باطنی وہاں حقیقی خلافت بن جائے گی اور ولکھ فیہا ما تشتہیٰ انفسکمْ و لکھ فیہا ما تدعون کا کھنا ظہور ہو جائے گا۔

بہر حال صنعت و عمل میں اسبابِ مادی سے بے نیازی صنعتی خلافت کی روح ہے خواہ اس کا مکمل ظہور عملی طور پر دنیا ہی میں ہو جائے جو شانِ انبیاء و اولیاء ہے یا اعتقاد کی قوت سے آخرت میں نمایاں ہو جبکہ صلحائے اُمت اس غنائے قلبی کو بذریعہ اعتقاد و جز و نفس بنالیں۔ پس جو ہی سکوناتِ نفس کے کھلنے کا دنِ دویم قیامت آجائے گا مومن کی یہ اعتقادِ قوتیں عملی طور پر نمایاں ہو جائیں گی اور اُس کی خلافت کا مد کا ظہور ہو جائے گا، جو درحقیقت اسی دنیاوی خلافت کا اُتھار اور بروز ہوگا۔

غرض صنعت و افعال میں خلافتِ الہی اُسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جبکہ

انسان و سائل ماقبہ کا درپوزہ گرد نہ رہے، خواہ حالہ خواہ استدلالہ و خواہ اعتباراً بلکہ خود
 وسائل اُس کے درپوزہ گرد اور غالب بنا دینے جائیں جو غنی عن العلیین کی شان ہے۔
 پس صنعتی خلافت کی اساس و بنیاد بھی وہی غنا اور ماسویۃ اللہ سے
 بے نیازی نکلی جو علم و اخلاق کی خلافت کی بنیاد تھی۔ اور واضح ہو گیا کہ وسائل
 سے غنی ہونے بغیر یا نہیں غیر مؤثر بالذات یقین کے بغیر اور پھر ان میں انہماک و
 شغف اور مبالغوں کو ترک کئے بغیر صنعت النہی کی خلافت میسر نہیں آسکتی اور
 جبکہ خلافت کی روح ہی غنا و توقل عشری تو جس درجہ کے غنا و توقل کی
 طاقت ہوگی اُسی درجہ کی طاقت کی خلافت بھی ہوگی۔ خواہ وہ علمی خلافت
 ہو یا اخلاقی اور صنعتی ہو۔

خلا اگر حق تعالیٰ کے بارہ میں قوت یقین و اعتماد عین الیقین کے مرتبہ
 پر فائز ہونے کے سبب یہ غنا و توقل درجہ حال میں ہو جس کی پڑیں قلب
 و قالب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ملکہ راجح کی شکل اختیار کر چکی ہوں تو
 خلافت حقیقی ظاہر و باطن مستحکم ہوگی جس میں علم اور اخلاق و صنعت
 اسباب ظاہری سے کلیتہً بے نیاز ہوں گے اور اختیار اسباب محض امتثال
 امر اور محض آداب عبودیت کے لئے ہو گا نہ کہ احتیاج کی بنا پر کیونکہ وہاں
 جنود ملائکہ کی نعمت اور خود ان نفوس طیبہ کی وعاہرہ حیات اذہرہ حیات
 والی اعمازی قوت سامعہ ہوگی جس سے اُن کی احتیاج صرف ذات حق سے
 وابستہ ہوگی کسی غیر سے نہیں۔ یہ خلافت انبیاء و اولیاء کی ہے۔ اسی کے
 تحت غزوہ بدر میں ملائکہ مستومین ہزاروں کی تعداد میں آئے تاکہ ان قلیل التعداد

مجاہدوں کے دلوں میں جہاؤ اور استقلال پیدا کریں۔ اسی کے تحت حضورؐ نے
 اعداء اللہ پر مسمیٰ بھر کنگریاں پھینک ماریں جو انہیں تیر و تفتک ہو کر گئیں۔
 اسی کے تحت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ موتہ کا جو شام میں
 ہوا، مدینہ ہی میں مشاہدہ فرماتے ہوئے اعلان فرمایا تھا کہ لڑائی کا جھنڈا اب
 نذیرینِ حادثہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ شہید ہو گئے۔ اور اب جمعہ طیارہ کے ہاتھ
 میں آیا اور وہ شہید ہو گئے اور اب عبد اللہ بن رواحہ کے ہاتھ میں آیا اور
 وہ بھی شہید ہو گئے اور اب خالد کے ہاتھ میں آیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔
 نیز اسی کے ماتحت فادوق اعظمؐ نے ممبر پر خطبہ پڑھتے پڑھتے ایک دم شام
 کی جنگ کی کمان شروع کر دی تھی اور مدینہ سے ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر بنبر
 کسی لاسلکی کی مدد کے "یاسا ساریتہ الجبل" کی آواز پہنچی کہ جنگ کا رخ بدل
 دیا تھا۔ اسی قوت غنا دے کے ماتحت بعد وفات نبویؐ عرب کے اہل تہاد کے موقع
 پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام عرب کے مرتدین کے مقابلہ پر تہا جنگ کرنے
 پر آمادہ ہو گئے تھے اور اسی قوت کے بل بوتہ پر چین کے کروڑوں انسانوں کو
 صرف دس پانچ ہی تاجر صحابہ نے جنگ کا الٹی میٹم دے دیا تھا اور اسی قوت
 کے ماتحت رومیوں کی ساتھ ہزار فوج کو حضرت خالدؓ نے صرف ساٹھ صحابہ کے
 لشکر سے شکست دے دی تھی۔

اسی قوت کی بناء پر قرآن نے فرمایا تھا کہ اگر تم میں بیٹیں صابرہ و متوکل ہوں
 تو دو سو پر غالب ہوں گے اور سو ہوں گے تو ایک ہزار کے لئے کافی ہو گئے۔
 اسی قوت کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھ کر ہفتوں کا ناپنا

ترک فرما دیتے۔ دو دواہ بیت نبوت سے دھواں نہ اٹھا اور بقائے حیات کے بارے میں فرماتے :-

يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْلِيَنِي - "میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور چلاتا ہے۔"

اسی قوتِ غنا کے ماتحت اولیائے امت کے زہد و ترک کی قوتیں کا فرما رہی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ باقی دارالعلوم دیوبند نے اپنی آخر عمر میں فرمایا کہ الحمد للہ! اب مجھے بقائے حیات کے لئے کھانے پینے کی ضرورت نہیں رہی صرف اتباعِ سنت کے لئے کھانا پیتا ہوں۔ "یعنی ذکر اللہ ہی غذا کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ اسی قوت کے تحت صحابہ کرام لمبے لمبے فاقوں کے ساتھ اور کبھی محض کھجور کی گٹھلیوں کو مزہ میں ڈال کر چوستے رہنے کے ساتھ مسلسل جہاد اور جنگ میں مصروف رہتے تھے اور معمولی سے معمولی ہتھیاروں کم سے کم تعداد اور بے سرو سامانی کے ساتھ وقت کی باقاعدہ مرتب کیل کٹنے سے لیس اور عبادی تعداد کی فوجوں کے ساتھ فاسخِ جنگ کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ جنگیں اور یہ احوال زہد و قناعت، مادی وسائل کے زینِ منت نہ تھے بلکہ قلبی جوشِ اعتقاد اور قوتِ یقین کے آثار تھے جس میں اسباب سے کمالِ استغفار اور مسببِ الاسباب سے کمالِ ربط و احتیاج تھی۔ پس یہ خلافتِ انبیاء و اولیاء کی ہے۔

ہاں اگر قوتِ یقین عینِ یقین کے درجہ کی نہ ہو اور غنا و توکل کا مادہ راستہ قلب میں جڑ پکڑے ہوئے نہ ہو لیکن پھر بھی حقِ یقین کے تحت غنا و توکل کی بشارت و طمانیت قلب میں پھیلی ہوئی ہو۔ قلب میں انشراح

ہو، جس میں علم و اخلاق اور صناعات گونا گونا گویا اسباب سے بے نیاز نہ ہوں مگر اعتقاد ان اسباب و وسائل کی اہمیت و وقعت پر کماہ کے برابر بھی نہ ہو اور اسباب اختیار کرتے وقت یہ تصور قلب میں راسخ ہو کہ یہ اسباب معض ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں فی نفسہ انہیں کسی ادنیٰ تاثیر کی مجال نہیں ہے اور نہ ہی ان اسباب و مسببات میں کوئی عقلی لزوم ہے کہ اسباب پر نتائج مرتب ہوں، بلکہ یہ سارا کارخانہ مشیتِ ایزدی کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے ان اسباب پر نتائج مرتب فرما دے اور جب چاہے روک دے۔ اس لئے اعتماد و بھروسہ کے لائق اسباب نہیں صرف مسببِ الاسباب کی ذاتِ بابرکات ہے، تو یہ خلافتِ صلواتِ امت کی ہوگی جن کا قلب کم سے کم علم و عمل اور صناعات میں محتاجی و مسائل سے خالی ہوگا۔ گو اعضاء و جوارح خالی نہ ہوں۔ اس قسم کے غفلانے عادل تمام واہمی اور واقعی خطرات سے نڈر ہو کر قانونِ شریعت پر چلنے اور چلائے ہیں اور اوامرِ الہیہ کے مقابلہ میں مخالفتِ اسباب کا، جو ہمیں خوفزدہ نہیں کر سکتا، بلکہ وہ یک رخ ہو کر ایسے تمام مادی وسائل کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پس یہ خلافت گو حقیقی نہیں ظاہری ہے مگر حقیقی ضرور ہوگی۔ اُمرائے عادل کے بہت سے حیرتناک تاریخی کا نام اسی اعتقادی قوتِ غنا و یک دہشی کے آثار ہیں جن سے اوراقِ تاریخ پُر ہیں۔

پھر اگر یہ غنا و توکل محض ایک خیال کی صورت سے قلب میں آمد و رفت اور گزرتو رکھتا ہے، مگر نہ توجہ پکڑے ہوئے ہے، نہ انشراح میں ہے اور نہ

کوئی دیشہ جاگزین نہیں اور یہ قالی بے حال بھی کئی رواجی مجبوری یا ذوال
اقتدار کے خوف یا مسلم قومیت سے خارج سمجھ لئے جانے کے خطرہ سے ہے
گویا زبان سے یہ کہنا بھی کہ

”کرتادھر تارخا ہی ہے“ اسباب میں کیا دکھا ہوا ہے

بطور یروشونکے باخواھدھ و تاجی قلوبھم (زبانوں سے تہیں راضی رکھنا چاہتے
ہیں اور دل اُن کا سس سے اٹکا رہی ہیں) کے ہو تو میاں نہ صرف اسباب ظاہری
کی اسیری اور محتاجی ہی ہوگی بلکہ اُن ہی پر پورا بھروسہ اور اعتماد بھی ہوگا اور
اُن کے ہونے نہ ہونے پر ہی قلب کی تسکین اور تشویش کا مدار ہوگا نیز اسباب
میں یہ غلو اور مبالغہ ہی مستتب الاسباب سے بیگانگی اور بے تعلقی کا ذریعہ
ثابت ہوگا۔

پس یہ خلافت نہیں صرف ادعائے خلافت ہوگا یعنی خلافت قالی ہوگی جو
وقت یقین کے کالعدم ہونے کے سبب محض صورت یقین سے زبانی دعوؤں کی
شکل میں مرزد ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جو نوعیت اُس اسلام کی ہے جو صرف زبان پر ہو،
دل میں نہ ہو وہی نوعیت اس خلافت کی بھی ہوگی اور اس کے بعد کئے لکھ کا مقام
ہے جہاں صرف بندگی اسباب ہے، عبادتِ مستتب الاسباب نہیں، سو اُس میں خلافت
یا غناء و توکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام قلبی جذبات اور باطنی حیثیات عمل سے
کھل جاتی ہیں اور عمل ہی ان قلبی مقامات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

بہر حال اس قدر سے خلافت کی نوعیت اور اُس کے مراتب و درجات کے
ساتھ ساتھ اُس کی اصل روح کی وضاحت بھی چوٹی کر وہ غنا و توکل اور بے نیازگی

اُس کی بشارت ہی قلب میں پھیلی ہوئی ہے۔ گویا بسلسلہ اعتقاد اللہ کے
معاملات میں نہ عین الیقین ہے نہ حق الیقین، بلکہ ایک اجمالی علم الیقین ہے
جس سے یہ دھیان تو آتا رہتا ہے کہ اسباب میں تاثیر خدا کی طرف سے ہے
لیکن اُس کی کسی کیفیت سے قلب آشنا نہیں جو علم و اخلاق اور صناعات میں
بے نیازی اسباب کی عزیمت پیدا کرے تو یہ خلافت عوام مسلمان کی ہوگی جو
درحقیقت خلافت ظاہری بھی نہیں بلکہ خلافت ظاہری کا ایک بے جان ڈھانچہ
اور کاغذی تصویر ہے جس میں علم و اخلاق اور صناعات، سب کے سب شدت
کے ساتھ اسباب ظاہری کے پابند ہوں گے اور اسباب و وسائل کے بے اثر
ہونے کی طرف کوئی ذہنی التفات نہ ہوگا بلکہ اسباب و مستببات میں لزوم کا
تصور ہر وقت ذہن پر چرایا ہوا ہوگا جس سے مسبب الاسباب پر بھروسہ اور
اطمینان کی وہ کیفیت نہ ہوگی جو مطلوب ہے، گو اُس کی تکذیب بھی ذہن میں
نہ ہوگی۔ اس درجے کے اُمراد و خلفاء معاشی مہمات اور بقائے اقتدار کی ضروریات
میں توجہ و چوبند ہوتے ہیں، لیکن اللہ کے معاملات میں سست، پس و پیش
کا شکار اور رسمی اندیشوں اور مصلحت آفرینیوں میں گرفتار ہوں گے اور کبھی
بھی اپنے داعیہ باطن سے خلافت کے حقیقی نصب العین کے احیاء و تکمیل کی
طرف مائل نہ ہوں گے۔ یوں اتفاقاتِ وقت اور احوال و عوارض کی مجبوریوں
سے اعلیٰ کلمۃ اللہ کا کوئی کام اُن سے مرزد ہو جائے تو یہ احوال کا نتیجہ
ہوگا خود اُن کے کسی عزم و جزم کا ثمرہ نہیں ہوگا۔

اور اگر غناء و توکل صرف درجہ قالی میں نوکِ زبان ہے، قلب میں اُس کا

اسباب ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت الہی کے معنی علم و عمل اور صنعت و افعال وغیرہ میں مادی اسباب سے مستقطع ہونے کے نہیں بلکہ غلایا اعتقاداً اُن سے بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے بھی اس غنائے مطلق کے باوجود اسباب بھی پیدا کئے اور اپنی قوتوں کو عادتاً اُن ہی کے ضمن میں نمایاں بھی فرمایا۔ اس لئے اسباب جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار، اسباب صنائع کے سلسلہ میں اوزار اور اسباب معاش کے سلسلہ میں کام و بار اپنی اپنی جگہ رہے گا، مگر زندگی میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجی ہوگی اور نہ عملاً اختیار و وسائل میں غلو اور مبالغہ۔ اس لئے داعیہ والہمہ ما استطاعت کے فرمان قدسی نشان پر اس سے کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دشمنانِ حق و صداقت کے مقابلہ میں یہ اعداد و مستطاع (امکانِ تیاری) اپنی جگہ رہے گی اور وہ قلبی غنا اور عملی عدم مبالغہ اپنی جگہ۔

پس آیت کریمہ نے امکانِ تیاری کا حکم دیا ہے اُس کی نوعیت اور کیفیت پر روشنی نہیں ڈالی کہ وہ کتنی اور کبھی ہونی چاہیئے۔ اس لئے اس امکانِ تیاری کی ہدایت تو اس آیت سے حاصل کی جائے گی اور اس کی نوعیت و کیفیت انبیاء علیہم السلام کے طرزِ عمل اور اولیاء و صلحاء کے طرزِ اتباع سے اخذ کی جائے گی اور وہ وہی غنا آمیز جد و جہد ہوگی جس پر سابق میں چند واقعات سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

پھر یہ صرف شرعی ہی حقیقت نہیں بلکہ دنیا کے عرف عام میں بھی غنا ہی کو کمال سمجھا گیا ہے۔ یعنی کمال وہی مانا گیا ہے جو نفس کا جوہر ہو اور نہ ظہور

میں نہ وسائل ظاہری پر معلق ہوں اُن کا محتاج ہو۔ ایک فنونِ جنگ سے واقف کار سپاہی جو ہتھیار چلانا جانتا ہے، یقیناً اُس ناواقف سے بڑھ چکا سمجھا گیا ہے جو ہتھیار اٹھانا بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ اول الذکر اپنی حفاظت میں دوسرے کا محتاج نہیں اور ثانی الذکر ہے پس بنائے فضیلت وہی غنا نکلا۔

پھر اس سے بھی برتر وہ ہے جو نہتہ ہونے کے باوجود محض ہاتھ کے داؤ بیچ سے دوسرے کے ہتھیار چھین کر اُسے نہتہ کر دے اور خود مسلح ہو جائے کیونکہ وہ ہتھیار کا بھی محتاج نہ نکلا جو پہلے غنا سے اونچا غنا ہے۔ اس سے بھی آگے وہ ہے جو نفس کی کسی اندرونی طاقت مثلاً نگاہ کو ریاضت سے مضبوط بنا کر محض آنکھ سے گھور کر ہی حریف کو گرالے اور نگاہ سے پتھر تک توڑ ڈالے، جیسے مسمریزم والے کرتے ہیں۔ پس یہ ہتھیار تو کجا ہاتھ پیر ہلانے کا بھی محتاج نہ رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ سمجھا گیا ہے جو قوتِ خیال کی طاقت سے چند کلمات ہی کے ذریعہ دشمن کو زیر کر دے جیسے سحر کی طاقت ہے جسے ریاضت سے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ پس یہ ہتھیار، ہاتھ پیر اور آنکھ کا بھی محتاج نہ رہا صرف زبان ہلا کر ہی حریت کو گر لیتا ہے خواہ وہ سحر حرام ہو یا سحر حلال۔

اس سے بھی اونچا وہ مانا گیا ہے جو روحانیت کی بے پناہ طاقت سے دشمنوں کی صفوں کو تہ و بالا کر ڈالے اور اپنی ہمتِ باطن سے دلوں کو لوٹ دے جس سے دل معرب ہو جائیں اور مسلح ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جائیں۔ گویا یہ وسائل کا محتاج نہ رہن کا محتاج، نہ نفس کا محتاج، صرف روح کا کارکن نہایت

ٹھہرا۔ خواہ اس طاقت کا ظہور تلوار ہی کے راستہ سے ہو۔ مگر اس صورت میں تلوار محض جیلہ کے درجہ میں ہوتی ہے اصل کام اندرونی قوت کرتی ہے اور اس طرح یہ تمام وسائل ایسے شخص کے سامنے بے اثر اور حقیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور جبکہ عام قلوب میں ہر گلے درجہ والے مستغنی کی عظمت و وعیدیت، سابقہ درجہ والے سے بڑھتی چلی جاتی ہے تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عرف عام میں بھی طاقت کی حقیقت وسائل سے بے نیازی ہے، وسائل کی محنت جگی نہیں۔

یسی وجہ ہے کہ پچھلے لوگ حتیٰ مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تفسیر کو کمال سمجھتے تھے اور ان کا مرکز توجہ زیادہ تر تعلیمات، نجومیات، فلکیات، نفوس عناصر و افلاک اور خود نفس انسانی کی اندرونی طاقتیں رہیں، جنہیں شاق ترین ریاضتوں سے مسخر کیا جاتا اور اپنے نفس کو ان معنوی قوتوں سے قوی کر کے ظواہر سے بے نیاز بنا لیا جاتا۔ بعض نفوس عناصر کی تفسیر کر کے حقائق عناصر تک جا پہنچے۔ بعض نے نفوس فلکیہ اور اوج سیارات سے نگاہ کش کیا اور عجائبات افلاک پر مطلع ہوئے۔ بعض نے ادوار سفلی و علوی سے جوڑ لگایا اور اپنے نفس میں خودی کی طاقت پیدا کی۔ بعض نے یہ دیکھ کر کہ ان تمام کائناتی طاقتوں سے کہیں زیادہ طاقتیں خود انسان کے نفس میں موجود ہیں، خود اپنی ہی اندرونی قوتوں، حواس خمسہ ظاہرہ اور اس سے اوپر حواس خمسہ باطنی کی طاقتوں کو دیا نصیب نفس کے ذریعہ ایک مرکز پر سمیٹا، مسخر کیا اور ان سے ہندو وسائل ظاہری کام لیا۔

غرض ان سب غیر محسوس شعبوں میں تسخیر معنویات ہر کے کے خود اپنی محبوبیت اس درجہ پر لے آتے تھے کہ وسائل کی محنت جگی باقی نہ رہے اور یہ نفس جہاں بھی ہو باکمال ہو۔ یہ نہ ہو کہ آفات و وسائل کے جہاں میں تو نفس باکمال ہو اور اس سے الگ ہو کر بے ہنر ہو جائے۔ یہ بے نیازی اگر عین خلافت نہ تھی تو کم از کم ریشہ خلافت ضرور تھی۔

اسلام نے ان تمام طاقتوں کو مخلوقات کی طاقتیں بتلاتے ہوئے انسان کو خدا کی لطیف اور لامحدود طاقتوں سے مستفید ہونے کی طرف متوجہ کیا اور انبیاء، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات و علویات سے گزار کر انبیاء کی لامحدود دستوں میں پہنچا دیا جو تمام روحانی اور مادی طاقتوں کا مرکز تھے، مگر اس طاقت سے استفادہ کا راستہ اتباع انبیاء بتلایا کیونکہ یہ کوئی گرتی راستہ نہ تھا کہ فنی طو پر اسے سیکھ کر مشق، ہم پہنچی جائے اور اس کے شعبہ سے اور کربت دکھائے جائیں۔ بلکہ ایک ارتقائی اور استقامتی راستہ تھا جس سے سعادت انسانی کی تکمیل پیش نظر تھی۔ جو تخلیقی انسانی کی اصلی غرض و غایت اور نماندگی الہی کی حقیقی روح ہے تاکہ اس الہی طاقت سے استفادہ کر کے انسانی طاقت علما و عملاً حد کمال پر پہنچ جائے اور نتیجتاً انسان کا استغفار اور وسائل ظاہری سے اس کی بے نیازی بھی حد کمال پر آجائے اور اس طرح اس میں خلافت الہی اپنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

لیکن آج کی مادہ پرست تحریکوں کی تمام تر کاوش حتیٰ مادوں کی تفسیر اور ان کی حسی خاصیتوں کو آلات کے ذریعہ انجھار انجھار کر چند مادی منافع کے حصول

میں مدد ہو چکی ہے، اُن کی طرف سے روحانیت اور معنویت رہے یا جائے
 سب برابر رہے۔ وہ مشینری و آلات کے ذریعہ مادوں کے جگر میں گھس کر فناء
 فی المادہ ہو چکی ہیں۔ گویا سائنس کی راہوں سے انسان اپنی معنوی قوتوں کا
 ذخیرہ لوہے، لکڑی اور پتیل کو سوئپ کر خود کو راہ ہولہ بیٹھا ہے۔ اگر یہ سلمانِ فریم
 ہے تو وہ بالکمال ہے ورنہ بے کمال۔ پہلی صورت میں انسان بالکمال بننا تھا
 اور اس دوسری صورت میں انسان کو اذکار بن کر لوہا، لکڑی اور برقی و بخار
 وغیرہ اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت
 میں انسان بے ہنر اور عاجز بن جاتا ہے۔ یہ انسانیت کی انتہائی پستی ہے
 کہ اُس نے اپنی جوہری طاقتیں کلیتہً لوہے اور پتیل کے سپرد کر دیں اور خود
 اُن کا در یوزہ مرن گیا اور پہلے لوگوں کا یہ اعلیٰ ترین خروج تھا کہ وہ اس لوہے
 پتیل کی طاقتیں اُن سے چھین کر خود اپنے نفس کو قوی، مضبوط اور بالکمال
 بنا لیتے اور ان اشیاء کو صرف ایک جیل کی حیثیت سے اختیار کئے رہتے تھے،
 نظر اُن کی مسبب الاسباب پر ہوتی تھی۔ اسی لئے جس میں یہ غناءِ حید کمال کو پہنچ
 جاتا تھا وہ علما بھی ان وسائل کے بغیر اپنے کمال کا اظہار کر سکتے تھے۔

پس آج کا انسان النیات اور فلکیات کی تو کیا عرفیات کی ادراج و افروغ
 حتیٰ کہ خود اپنی نفسیات کو بھی اپنے اندر جذب نہ کر سکا۔ وہ اگر گرا تو جہانیا
 اور وہ بھی فلکی نہیں، سفلی اور سفلیات میں بھی محض مادیات اور حسیات اور وہ
 بھی ہمتا جی کی آلات و وسائل میں اگر گرا جس سے اُس کی در یوزہ گری اور
 محتاجی یا بگلی اور زیادہ چڑھ گئی اور وہ شرب انسانیت جو غنا و بے نیازی

سے پیدا ہوتا خاک میں مل گیا، جو بلاشبہ انسانیت کی حد سے گزری ہوئی پستی و
 در ماندگی ہے۔ مگر طرہ اُس پر یہ ہے کہ اس ذلت و پستی پر رب العزت کی خلافت
 کا دعویٰ اُن کا زمین و آسمان ایک کر دیا گیا ہے۔ پس جاتو وہی ہے انسانیت
 حقیقی ذلت کی طرف اور بر خود غلط ذم کیا جاتا رہا ہے اُس کے اوجِ رفعت پر
 پہنچ جانے کا اور نہ صرف رفعت و عزت ہی کا بلکہ اللہ کے واحد مانندہ اور خلیفہ
 بن جانے کا و قاتل اللہ نہیناں شہیدی اعلیٰ ملین۔

پس اگر خلافتِ الہی سے اشتباہ اور اقرب کچھ طرہٴ عمل تھا تو اُن پھلوں کا تو
 تھا، جو معنوی اور نفسانی کمال پیدا کر کے طلسمات وغیرہ کی صورت میں نفس کو
 خواہر سے بے نیاز کر لیتے تھے۔ گویا ان میں بعض مطلق تھے اور بعض متقی یعنی روحانی
 والے کمال، استعداد پیدا کر کے حقیقی خلافت کے مقام پر آجاتے تھے اور یہ نفس یا
 آفاق کی محنتی خاققوں کے تفسیر کنندے خلافت کی شبیہ اختیار کر کے خلفاء کے مشابہ
 بن جاتے تھے۔ لیکن آج کے آدھ پرست طبقے خالص حیات کے نوگر بن کر اور
 مادیات کے محتاج محض ہو کر نہ صرف خلافت اور شربِ خلافت ہی سے بیحد ہیں
 بلکہ خلافت کی صورت و حقیقت دونوں ہی کے لئے مخرب ثابت ہو رہے ہیں۔
 کیونکہ ان کے یہاں خلافت کی اولین خیریت غنا و استعداد ہی نثار دے رہا تھا
 بعبارتِ خلافت چہ رسد؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ احوال یا استغنائے وسائل پر اعتقاد کے بغیر ان
 مادی اسباب کے طبعی خواص و آثار ظاہر ہی نہ ہوں گے بلکہ یہ ہے کہ خلافت کا
 تحقق نہ ہو گا۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی بہت سی مادہ پرست اقوام سے ان

بن سکتا۔ بلکہ علم و اخلاق اور صنعت کاری میں غناء و توفیق کے درجات طے کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر علم بے کتاب و بے معبود اوستا، کا مصداق بن کر علم لائی بن جائے۔ اخلاق تخلیق باخلاق اللہ کا مصداق ہو کر خلق حسن ہو جائیں اور قول "قُلْ غُفْرٌ اَوْ كُفْرٌ اَشْرَبُ" کا مصداق ہو کر انقاء و الہام اور فراست بن جائے اور فعل "وَمَا تَرَىٰ تَنْبِيْثٌ اِذَا تَرَىٰ مَيْثٌ" وَلَيْكَ اللّٰہُ سَمِیْ" کا مصداق بن کر فعل صدق ہو جائے، گویا اُس کا کہا ہوا اور کیا ہوا اُس کا نہ ہو بلکہ اُس کے خدا کا کہا ہوا اور کیا ہوا ہو اور وہ حقیقی معنی میں قولاً و فعلاً نما تہ حق ہو جائے تو غفلت کامل ہوگی ورنہ حسب نقص درجات ناقص رہ جائے گی۔ اب جن اقوام میں خلقت کی یہ بنیاد ہی نادر ہو، نہ عقیدہ موجود نہ حال تو ان پر منصب خلافت کو چپا کر کے انہیں خلائق الہی یا عملی مومن کہنا اور ان کے مقابلہ میں مسلم اقوام کو جو کم از کم عقیدہ تان مادی اسباب کو باوجود استعمال کرنے کے کوئی اہمیت نہیں دیتیں بلکہ صرف مستب الاسباب ہی کو مؤثر حقیقی مانتی ہیں، عملی کافراور لفظی مومن کہنا کہاں کا انصاف اور حق پسندی ہے اگرچہ وہ محکوم ہی کیوں نہ ہوں

وَلَمْ يَدْعُوا مَوْثَ عَيْنٍ مِّنْ اٰرَاقِيَانِ مَوْثَ بَنَدَ ہَسْرَہٗ مَشْرَکَہٗ اَکْرَہِ
مَشْرِیْہِ وَلَوْ اَعْجَبَکُمْ -

یہ تم کو اچھا نہ معلوم ہو۔

مگر یہ غنائے حقیقی جو ان نینوں غلامتوں علمی، اخلاقی اور صنعتی و انضامی کی روح ہے اُسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب اللہ کے علمی قرآن یعنی کتاب اللہ سے تو علم حاصل کیا جائے اور اُس کے استدلالی اور برہانی قرآن یعنی کلمات اللہ کی محسوس مثالوں سے اُس کی معنویات کو سمجھا جائے اور اُس کے اخلاقی اور تعمیل

اعتقادات و احوال کے بغیر بھی مافوق العادت صنایعوں اور مادی اختراعات کا طور پر اُور آج بھی بہت سی مادی قومیں ان وسائل سے بلا اعتقادِ ثائیر الہی تمدن کے حیرتناک کرشمے دکھلا رہی ہیں جس سے سطحی طور پر ان کے غلامانے الہی اور ایجاد و اختراع میں نائبِ خداوندی ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے لیکن یہ خلافت نہیں صورتِ خلافت کی ایک ظالمانہ پرچھائیں ہے جس میں نہ صرف یہ کہ خلافت کی دُور و غدا و توکل موجود نہیں بلکہ اُس کی جُذہ موجود ہے۔

پس طبعی خواص و آثار کا تحقق یہاں ضرور موجود ہے۔ اگر منصب خلافت اُس کے اُس پاس بھی نہیں صرف استدعا جائیے مادی کرشمے اُن کے ہاتھوں نمایاں کئے جا رہے ہیں نہ کہ کسی مقبولیت کی بناء پر جو روح خلافت ہے۔ پس جیسے کمانے پینے میں ذائقہ نیت پر موقوف نہیں مگر اجر و ثواب نیت پر موقوف ہے۔ ایسے ہی ماقیات کے طبعی آثار و خواص کا ظہور غنائے اسباب کے عقیدے یا حال پر موقوف نہیں بلکہ خلافت کا منصب اور خدا کا مقبول نائب ہونا بلا شبہ اس غناد و توکل کی شان پر معلق ہے۔

پس جو قومیں رات دن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجی اور غلامی میں نہ صرف بسر کر رہی ہیں بلکہ ان مادیات کی بندشوں نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنایا ہے جس سے وہ روحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں، نہ وہ غناء و توحید سے عقیدہ تاسر فراہم میں مدحاً، تو انہیں خلافت الہی سے کیا تعلق، کیونکہ خلافت الہی کو خوش قسمت اولیٰ ہی ان وسائل سے غناء ہے حالانکہ ہوا اعتقاداً، خلیفہ الہی ہتھوڑہ دار اور رسول و ننان سے نہیں

قرآن یعنی رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ سے عمل بالقرآن کا ڈھنگ سیکھا جائے اور عملی دستور زندگی بنا کر زندگی کے ہر گوشہ میں جذبۂ اتباع سنت کے ساتھ اُس کی پیروی کی جائے۔

(پس کتاب قرآن حق کا راستہ دکھائے گا، کائناتی قرآن اس راستہ کو فہم کی گزریں میں آنا دے گا اور اللہ کا علی قرآن یعنی رسول پر حق اپنے عملی اُسوں سے اُس پر عمل کرائے گا جس سے نفس میں ملکاتِ خلافت رائج ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جب علم کتاب اور دلائل علم کتاب سے مقصود اثبات مدعا ہے اور مدعا سے مقصود اُس پر عمل پیرائی ہے اور عمل کا نمونہ رسول کی ذات ہے تو تینوں قرآنوں کا حقیقی مقصد اُسوۂ رسول پر چلنا نکل آنا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ اس علی قرآن کا علی پہلو یہ کائنات نہیں کیونکہ وہ تو صرف تمثیلی اور برہانی قرآن ہے بلکہ علی قرآن ذات محمدی ہے جس نے قرآنی ہدایات کو براہِ راست صاحب قرآن (حق تعالیٰ) سے سمجھ کر اُس پر عمل کرنا سیکھا اور اُسے کر کے دکھایا اور ہر ہدایت قرآنی کا علی خاکہ اور نمونہ اُمت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لئے اس علی قرآن کے نقشِ قدیم کی پیروی ہی فی الحقیقت قرآنی ترقی، ایمان داری اور خلافتِ الہی ہوگی۔

پس قرآن کا اصل مقصد اتباع سنت اور اقتداء اُسوۂ حسنہ نکل آتا ہے جس کے لئے یہ ساری کائنات ایک وسیلہ محض نہ جاتی ہے۔ نہ یہ کہ اُن علی قرآن (ذات نبوی) کے نمونہ عمل سے تو قطع نظر کر لی جائے اور علی قرآن (یعنی کتاب اللہ کی محض تعبیرات کو) لے کر اپنے مقاصد کی بلاغت بیانی کا آلہ کار بنالیا جائے کہ تعبیرات قرآن کی ہوں اور ذہنی منصوبے اپنے ہوں جن کو اُس کی بلاغت بیانی

کے پردوں میں چھپا کر پیش کر دیا جائے اور اس اسلوب پر قرآنی مقصد مادہ کی توجہ بھڑا کر مادی تصرفات بٹھرا کر اس کا نام عمل بالقرآن لکھ دیا جائے۔ اگر یہی عمل بالقرآن ہے تو اس سے زیادہ گھماٹے کا سودا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اس مادی صنعت گری کو قرآنی عمل کہہ کر جب صرف مادہ کی توجہ بھڑا دی ہی میں عمرِ عمرِ گنوا دی جائے گی تو یہ مادہ اور مادی لذات تو یوں نہ رہیں گی کہ وہ ختم عمرِ برہنہ ہو جائیں گی اور اُفروزی لذات یوں نہ ہوں گی کہ انہیں مقصود بنا کر دنیا میں اُن کی تحصیل و تکمیل کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا تھا تو یہ صحیح معنی میں خسر اللہ نیا و الاخرۃ کا مصداق ہو جائے گا۔ جس کا خلاصہ دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ یہ توجہ بھڑا کر بندہ سائنس یا عبدالاسباب خلیفۃ الہی تو یوں نہ بنا کہ بندگیِ اسباب کے ساتھ یہ مادی تصرفات بلا روحانیت اور بلا غنائے نفس خلافت نہیں، خلافت کا لاشہ ہیں جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور آخرت میں خلیفہ یوں نہ ثابت ہوگا کہ بنائے خلافت یعنی مستغنیانِ علم، غنیانِ اخلاق اور بے نیازانِ کسب و عمل کو اُس نے مقصد قرآن ہی نہیں سمجھا کہ اُسے اختیار کرتا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ نفس ناکارہ علم و معرفتِ الہی سے کورا رہ کر جہانِ مابعد میں اس طرح پہنچے گا کہ نہ تو وہ اللہ ہی کا خلیفہ اور نمائندہ ہو، کیونکہ مادی وسائل سے بے نیازی اُس میں قائم ہی نہیں ہوتی تھی اور نہ وہ اپنا ہی نمائندہ ہوگا کیونکہ وہاں اس کو دے اور عاری نفس کی وہ خودی اور خودداری قائم نہ رہے گی جو دنیا میں ان فانی وسائل برق و بخار، انجن، مشین اور لوہے لکڑی کے بل بوتے پر قائم تھی تو صحیح معنی میں یہ نفس خسرانِ دنیا اور حرمانِ آخرت کا مورد ہو کر رہ جائے گا، ورنہ طرح

یہ نام نہاد خلافت، خلافت نہیں حاکمیت ثابت ہوگی۔ اگر معاذ اللہ عمل یا لغز ان کا
نتیجہ سی جرمان و خمران دارین ہے تو قرآن کو دنیا میں آنے اور اچھی غامی مخلوق
کو جو قیصر و کسریٰ کے زیر سرپرستی خلیفہ اللہ بنی ہوئی تھی، دارین کے جرمان و خمران
میں مبتلا کرنے کی آخر کیا ضرورت پیش آئی تھی؟

ربانی نظریہ صنعت و حرفت اور مادی تقرنات کا سوال، مسودہ قرآن اس کا
منازع ہے نہ دین نے اس سے معانت کی ہے اور نہ کوئی عقلمند اس کے خلاف
آواز اٹھا سکتا ہے۔ دنیا میں نہ کہ دنیوی ضروریات سے روک دیا جانا عقل و
نقل دونوں کے خلاف ہے۔ مگر

کار دنیا کن و اندیشہ معنیٰ مگذار تابعی زسی دامن دنیا مگذار

یعنی یہ ضرور ہے کہ یہ نتائج اور مکاسب اصول قرآنی کی رو سے دارین میں
کار آمد اور موجب فلاح جب ہی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خود مقصود نہ ہوں بلکہ کسی
اوپر نصب العین کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال میں آئیں جن میں نہ غلو ہو
اور نہ مبالغہ اور نہ ان کے ساتھ ساتھ مقاصد کا سا غیر معمولی شغف اور دلچسپی ہو اور
ظاہر ہے کہ یہ اور سچا نصب العین وہی خلافت ہے جس کا حاصل اعلیٰ علیہ السلام
ہے اور جس کا طریقہ خدائی علم ہے راستہ ہونا۔ خدائی اخلاق سے متعلق ہونا اور
خدائی رنگ صنعت گری سے رنگین ہونا ہے اور ان سب کی بنیاد وہی غنا
عن الوسائل ہے نہ کہ عشق وسائل۔ اس لئے یہ مادی وسائل اور مادی تقرنات
خود خلافت نہیں بلکہ خلافت کے ادنیٰ ترین وسائل ثابت ہوتے ہیں اور کسی
طرح جائز نہیں ٹھہرتا کہ ان میں مقصود اصلی سمجھنے یا ان کے ساتھ مقصود کا سا بڑا

کرنے اور ان میں ڈوب جانے کو عین ایمان داری یا خلافت خداوندی اور ایمان و
تقویٰ پکارا جائے لگا۔ کیونکہ ایسا کر نادین کا حلیہ بگاڑتا اور اسے اُدھیر کر
از خود بٹکانا اور وہ بھی سونے کے تار کے بجائے رنگ آلود سیاہ لوہے کے تار سے
بٹناب ہے جو خوشنما ہے نہ بدظاہر ہے اور نہ مقبول ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دین، صنعت و حرفت اور تسخیر عالم میں کمال حاصل
کرنے یا اس پر قابو پالینے کا تو مخالفت نہیں مگر اس کے نزدیک عام طبعی ضروریات
زندگی کے معمولی کسب و اكتساب کو چھوڑ کر ایجاد و اختراع اور تسخیر کائنات کا
مطلوب طریقہ مادی تقرنات نہیں بلکہ روحانی تقرنات ہے۔ عالم کو مادی قوت سے
ذیر کرنا نہیں بلکہ روحانی قوت سے قابو میں لانا ہے جو اسباب و وسائل دنیویہ
سے بے نیاز طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی تقرنات کا راستہ عقل و دانش لال سے
طے نہیں ہوتا بلکہ عشق الہی اور اتباع نبوی کے شغف سے طے ہوتا ہے اور یہ
اُسی وقت ممکن ہے کہ مادی اسباب میں غلو اور مبالغہ سے طبیعت کو روکنے
کی ٹھوپیدار کر لی جائے۔ یہ راستہ مضبوط بھی ہے اور دوامی بھی ہے جو دنیا سے
لے کر آخرت تک قائم رہتا ہے اور اس پر مسافت ہر وقت اور ہر مقام میں
ممکن رہتی ہے۔ گویا آخرت بھی جتنی ہے اور دنیا بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ بخلاف
مادیت محضہ اور وسائل تقرنات کے، کہ یہ راستہ جوہری راستہ بھی نہیں جو صرف
انسان کی اندرونی طاقت سے طے ہو اور بلحاظ تئجیو لیتی ناقص بھی نہیں کہ اس
پر ثروت کا مرتب ہونا لازمی ہو۔ پھر ہر ایک کے لئے عام بھی نہیں کہ سب کو یہ وسائل
میسر ہی آجائیں اور ساتھ ہی پائدار بھی نہیں کیونکہ آخرت کی پہلی منزل پر یہ

تمام وسائل اور تصرفات بے کار ثابت ہوتے ہیں جس سے دنیا تو ختم ہو جاتی ہے اور آخرت بقی نہیں۔

پس پہلا راستہ تو فی الدُّنْيَا خَسِرْتُ وَفِي الْآخِرَةِ خَسِرْتُ کا مصداق ہے اور دوسرا راستہ خَسِرْتُ الدُّنْيَا وَآخِرَتَهُ کا مصداق ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اسلام صنعت گیری کی قوت پیدا کرنے اور اُسے ظہور میں لانے کا مصلحت میں بلکہ داعی ہے مگر اپنے ہی راستہ سے۔ وہ چاہتا ہے کہ خلیفہ الہی حقائق کائنات پر مطلع ہوگا اُن کا اگر مطالعہ بھی کرے مگر محض پیشانی کی نہیں، بلکہ پیش آنی کی آنکھ سے، وہ ان میں تصرفات بھی کرے مگر خارجی وسائل کا محتاج ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی اندرونی طاقت کے بل بوتہ پر۔ پس خارجی وسائل کی محتاجی سے مادہ کی توڑ پھوڑ خلافت میں بلکہ خلافت کی ظلمات پر چھائیں ہے جو ہمیشہ اصل کے خلاف چلتی ہے۔

لیکن پھر بھی جو لوگ اس واقعی حقیقت کے برخلاف کائنات میں محض مادی تصرفات اور مادی توڑ پھوڑ میں مبالغہ اور غلہ جی کو سب کچھ جانتے ہیں اور اسی کو ایمان داری اور خلافت کہہ کر رہے ہیں اُن کی غلطی کا مشوار وہی صحیفہ کائنات کو قرآن کا عملی پہلو کچھ کر اُسے علی قرآن کا لقب دیدنا اور اسی سے علی نوئے اخذ کرنا ہے۔ آنحضرت کا واقع ہو چکا ہے کہ یہ صحیفہ کائنات علی قرآن نہیں جس سے عمل کے نمونے لئے جائیں بلکہ قرآن تخیل اور بُرہانی قرآن ہے جس سے نظریات قرآن کے اثبات کے لئے دلائل نظر و فکر کے نمونے لئے کرنظر کو مصنوع سے صانع تک پہنچانا ہے، وہ خود انسان کے لئے عمل نہیں کہ اُس کے مادیوں کی توڑ پھوڑ کو مقصد حیات سمجھ کر رات دن اُسی کے جوڑ توڑ سے اُسی کی مادی گمراہیوں میں غرق ہو جانا اور

دُخان و بخار اور برق و غاز وغیرہ کے نئے نئے نمونوں کو قابو میں لاکر دُنیا پر نہیں اُڑانا ہے جس کا نتیجہ خود کو اور ساری دُنیا کو برباد کر دینا ہے۔

پس علی قرآن جس سے قرآن کے تقاضا کردہ عملی نمونے اور اُس سے اخذ کئے جائیں، کائنات میں بلکہ پیغمبر کی ذات ہے، کائنات دعاوی قرآنی کے لئے صرف جتنی دلائل کا مجموعہ ہے کہ اُن دعاوی کا تقاضا کردہ عمل پس اُسوۂ اندرون صرف اُسی ذاتِ بابرکات سے حاصل کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ ذاتِ نبوی کے اس اُسوۂ حسنہ اندرونِ عمل کی روح مادی شغف میں بلکہ وہی علم الہی، غنائے کامل، و وسائل مادی سے بے نیازی اور اُن پر روحانی تسبیح و تہنیت سے قابو پانا ہے جو آپ کے ہر شعبہ زندگی سے نمایاں ہے۔ پس آپ کے یہاں اسبابِ معاش کی فراہمی ضرور ہے مگر اجمالِ طلب اور توکل کے ساتھ۔ جہاد میں ہتھیار ضرور ہاتھ میں ہے مگر ہتھیار کی قوت سے زیادہ قوتِ یقین اور اتانابت الی اللہ کی طاقت آگے آگے ہے۔ نظم ملت کا سامان بھی ہے مگر ان تفکرات اور وسائلِ عامرہ کے راستہ سے نہیں بلکہ ایمان باللہ اور عمل صالح کے راستہ سے۔

ظاہر ہے کہ اس فرق کے بعد ”دو قرآن“ کا نظریہ باقی نہیں رہتا بلکہ جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے اگر نظریہ بنتا ہے تو تین قرآن کا بنتا ہے کہ ایک اللہ کا علمی قرآن ہے جو اوراق میں مرقوم ہے یعنی کتاب اللہ۔ ایک اُس کا بُرہانی اور تمثیلی قرآن ہے جو اوراقِ عناصر و مواد میں مکتوم ہے یعنی کائنات اللہ جسے غلطی سے عمل قرآن باور کرا دیا گیا ہے اور ایک اللہ کا علمی قرآن ہے جو ذاتِ محمدی میں مکتوم ہے یعنی رسول اللہ (جسے کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہے) نظریہ کے

بدل جانے سے قدرتا مسائل کا رد بھی بدل گیا۔ معنی علی قرآن ذات ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ مسائل قائم نہیں رہ سکتے کہ قرآن کی دوسے کلمات کی پہلی ترقی کامیدان ہواؤں میں اُٹنا، بادلوں میں گھس جانا، زمینی مسافیتیں برقی باد سے لٹخوں میں طے کر لینا، لاسلکی سے مشرق و مغرب کی خبروں کو ایک کر دینا۔ ایک سرے وغیرہ سے بدن کے چھپے ہوئے امراض کا سراغ لگالینا، دل کی دھڑکنوں کے اسباب و علل پر بذریعہ آلات مطلع ہو جانا اور درجہ مادر کے کمزورتا کو باہر لے آنا یا پھر ان اسباب کی مضطرمانہ حجات سے دیکھی جاہ و جلال اور کثرت و پیداکر لینا یا ان میں سے مملک آلات سے دُنیا پر استبداد اور اقوام دُنیا پر استعباد، دغلام سازی، تسلط کر دینا وغیرہ وغیرہ ہے۔ بلکہ اب ہم انسانی ترقی کو حقیقتہً کائنات میں ڈھونڈنے کے بجائے ذات نبوی کے اُسموں میں تلاش کریں گے تو وہاں اس نمائشی خلافت یا تحریری خلافت کے نمونے ملیں گے، جن کی علم الہی، معرفت ذات و صفات، عظمت شریعت، اخلاق ربانی، غناء و ایثار، خدمت خلق اللہ اور خلق الہی کو مادیات کے دلدل سے نکال کر روحانیت کے میدان میں پہنچانا اور انسانی عیش سے روحانی لذت کی طرف منتقل کرنا نمایاں ہوگا۔ وہاں فناء میں اُڑنے کے بجائے روحانی فضاؤں میں عروج کرنا۔ مشرق و مغرب کو ایک کر دینے کے بجائے آلتیائی علوم سے عرش و فرش کو ایک کر دینا اور فرش زمین کو عرش بریں کی الہی خبروں سے منور بنا دینا، بدن کے امراض کے بجائے قلوب و نفوس کے چھپے ہوئے مہکنا اور روگ کھول دینا، جن کی اصلاح سے بدن بھی صالح بن

جانے۔ دل کی حتی دھڑکنوں پر مطلع ہونے کے بجائے لطیف قلب کی کھٹک اور پراگندگیوں پر مطلع ہو کر سکون قلب کا سامان متیا کرنا جس سے یہ صنوبری صنفہ گوشت میں ساکن ہو جائے۔ درجہ مادر کے کمزورتا کھولنے کے بجائے دل و نفس کے مخفی امراض کھولنا، نمائشی کثرت و فرخ کے بجائے تواضع و فروتنی اور مساوات کے جذبات اُجھارنا، مملک آلات سے مخلوق خدا کو بے درد انداز سے تباہ کرنے کے بجائے محبت و عافیت اور عالمی امن و سکون کے دروازے کھول دینا اور عالمگیر اخلاق کا ملہ سے دیانت و امانت، محبت و بہبودی، ایثار و احسان کے جذبات پیدا کر دینا، معاشی کو دیکھی انداز سے روکنے سے زیادہ دلوں میں عافیت سے نفرت بھٹا دینا اور انفس میں نفس و شیطان کی حکومت کے بجائے عقل و شرع کی حکومت قائم کر دینا وغیرہ واضح ہوگا جو حقیقتاً خلافت الہی کا تقاضا کروہ عمل اور اَلنَّبُوۃُ الْکَمَلٰتِ لَکُمْ وَبِنَکُمْ اکسچا مصداق ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دُنیا کو سنوارنے کا طریقہ اچھی چیز میں بنانا نہیں بلکہ اچھے آدمی تیار کرنا ہے۔ خلافت کے معنی نیکو طریق قائم کر کے بازاروں کو تجارتی سالانوں سے بھر دینا نہیں بلکہ دل و دماغ کی رنگ آلود نیکوئیوں کو صاف کر کے ان پر پاکیزہ افکار، پاکیزہ عقائد اور پارسائی کے اعمال ڈھال کر نکالنا ہے جس سے انسانیت نشوونما پائے اور ہمیت اور درندگی کو فروغ دینے کا موقع نہ ملے۔

اس فرق کے بعد عالم کے بہرہ اور خلفائے الہی ملان یورپ یا ملان ماضی، فرعون، ہامان، نفوذ اور شہداء یا قیصر و کسریٰ ثابت نہ ہوں گے، جنہوں نے مادی سائنس کے شاہکاروں سے دُنیا کو مہمور کیا بلکہ اس اُسوۂ محمدی کی روشنی میں

صديق و فاروق، علی و عثمان، خالد و ابو عبیدہ اور اوپر چل کر حضرت موسیٰ و علیؑ
حضرت نوح و ابراہیم اور تمام انبیائے سابقین اور تمام صلحاء عالم ثابت
ہوں گے جنہوں نے صفحہ کائنات کا گہرا مطالعہ کر کے ان مادی شاہکاروں کو
مٹانے میں اپنی پوری قوت صرف فرمائی۔ دو جانیتوں کو اباجر کے مادیت کو
سرنگوں کیا اور مادی وسائل کی محتاجگی سے مخلوق کو نکال کر روحانیت کی آفاقی
فضائیں پہنچایا۔ تا آنکہ مادی زندگی کے سکون و لذت سے بھی محروم نہ رہے اور
روحانی زندگی تو ان ہی کا حقیقی مقصد تھی۔

دہایہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگوں میں وہی مادی وسائل لاتے تھے
جو دشمن لے کر آتا تھا، سو یہ نہ کوئی عقلی نظریہ ہے نہ تاریخی، کبھی تشدد کا مقابلہ عدم
تشدد سے ہوتا ہے جیسے مکہ کی زندگی میں ہوا۔ اور آج بہت سی اقوام نے اس اصول
پر طاقت ور دشمن سے نجات حاصل کر لی اور حرب و ضرب کا مقابلہ صلہ و رفاقت
بمحول سے کیا اور فتح پائی۔ جس سے واضح ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کبھی اخلاقی
قوت اسلحہ سے بھی زیادہ کام دیتی ہے۔ اس سے بھی اوپر کا مقام روحانی قوت
ہے یعنی تعلق مع اللہ، اور رابطہ عبد و معبود جو ہر قوت سے بڑھ کر ہے اگر اسلحہ
اور سامان جنگ کی قلت کے ساتھ روحانیت، قوت یقین، توکل، صبر و استقامت
اور صوبت شہادت کی محبت کا جوش ہو اور انسان اللہ کا سپاہی بن کر میدان
میں آجائے تو اس کے سامنے بڑے بڑے سامانوں والی فوجیں نہیں ٹھہر سکتیں
سلف کی جنگیں اسی عنوان کی تھیں۔ وہاں نہ اس کی پرواہ کی جاتی تھی کہ پہلے
فوج کی تعداد دشمن کی فوج کے برابر کر لیں، نہ اس کی کہ سامان دشمن کے جیسے

سامان کے برابر ہو جائے، نہ اس کی کہ پہلے مال و دولت کم از کم دشمن کے اموال کے
مساوی ہو جائے۔ تعداد کے بارہ میں تو ان کے سامنے ہدایت رہانی تھی :-
كَذَٰلِكَ يَنْفَخُ الْفُجَاءُ فَتُلَاقِيَهُمْ مِنْ أَهْلِ الْيَمِينِ ۖ وَكَذَٰلِكَ يَنْفَخُ الْفُجَاءُ فَتُلَاقِيَهُمْ مِنْ أَهْلِ الْيَمِينِ ۖ
النَّبَا ۖ بَرِئِينَ - اور ان تینوں جنگوں میں تو ان کے سامنے ہدایت رہانی تھی :-
جس میں تعداد کی قلت کا تدارک صبر و استقامت سے نہ کیا گیا ہے نہ کہ تعداد
برابر ہو جائے کے انتقام میں اصل مقصد سے روکا گیا ہے۔

مصادیق جنگ کی قلت و کثرت کے بارے میں ان کے پیش نظر صاحب
شریعت کا یہ فرمان رہتا تھا :-

اِنَّكُمْ لَنْ تَسْعَوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ
وَالْكَثْرَ تَسْعَوْهُمْ
یعنی وسائل مادی سے غلبہ نہیں پا
سکتے بلکہ اپنے اخلاق (یعنی وسائل روحانیہ)
سے غلبہ آسکتے ہو۔

سامان رسد کے بارے میں ان کے پیش نظر یہ منظر تھا کہ حضور مرورِ دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب میں خندق کو دھڑے میں اور فاقوں کی کثرت
سے ہن کو سہارا دینے کے لئے پیٹ سے پتھر بندھے ہوئے ہیں جبکہ دشمنوں کے
پاس سامان رسد کی کوئی کمی نہ تھی۔

پس یہ نظریہ کہ حضور جنگوں میں وہی سامان اور ویسے ہی اسلحہ لیکر
تشریف لاتے تھے جیسے دشمنوں کے ہوتے تھے نہ عقلی ہے نہ تاریخی۔ ہر
قوم اپنے مزاج کے مطابق سامان کرتی ہے۔ مسلم قوم کا اصلی مزاج سلمانوں پر

توکل نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ اور اپنی عبدیت کے پیش نظر یا نفس کو فی الجملہ تسلی دینے کے لئے کسی حد تک وسائل کا اختیار کر لینا ہے۔ یہی ان کی تاریخ ہے اور یہی اُن کا مزاج۔ دوسری اقوام کے مزاجوں کی رعایت میں غرق ہو جانے یا مروجیت کے ساتھ اقوام کی نقالی کرنے یا آج کی متمدن اقوام کی مادی ترقی کو سہوہ اور نمونہ بنا کر اُس کے معیار پر اپنے آپ کو جابختنے سے یہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنے اصلی مزاج پر آجائیں اور ان جدید رجحانات اور جدید تقاضوں کے پورا کرنے کے زبان درخشاںات کو ترک کر کے اپنے ہی اصلی رجحانات اور بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یہ ذہنی کشمکش ختم ہو جائے جس نے آج پریشانی میں ڈال رکھا ہے۔ مقصد سلف کا مذاق پیدا کرنا اور اُسی مذاق پر ظاہری سامان اور مادی وسائل کا مہتیا کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر صحیح نتائج پیدا ہونے کی صورت نہیں ہے۔

ان تصریحات کے بعد ہمارے نزدیک مادیات سے ملنا کی جمالت محض نہیں رہتی البتہ روحانیات اور اسلامی مذاق سے منہ لٹ ملنا کی جمالت مہمک ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ملنا تو روحانیت کا عادت بن کر مادیت کے نشیب و فراز سے بھی نا ملد نہیں رہتا۔ لیکن بے بصیرتہ مخالف ملنا سائنس کی ناقص معلومات پر بھروسہ اور ناز کر کے حقائق البتہ سے یکسر غافل رہ جاتا ہے یعنی اطاعت کی راہ سے ملنا تو عادت اسرار ہو جاتا ہے اور اس کے بار کی راہ سے مخالف ملنا اپنا فطری سرمایہ بھی کھو بیٹھتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ مگر ملتا ہے میری مراد کٹھن ملنا اور بے بصیرت کٹھن تحت لوگ نہیں بلکہ وہ عادت و بالبصیرت ملنا ہے جس کی نگاہوں

میں حقائق البتہ سمائی ہوئی ہوں اور اس لئے برق و بخار گیس و دخان وغیرہ جیسی حقائق مادی اُسے لمو و لعب نظر آتی ہوں۔

اس سے میرا مقصد مسلمان کے حق میں سائنس اور فلسفہ کے میدان کو تنگ کرنا یا قوت و شوکت کے مادی وسائل سے کلیتہً محروم بنانا نہیں بلکہ اُن کی حدود بتلانا ہے کہ وہ وسائل محض ہیں مقاصد نہیں۔ تحفظ خلافت کے وسائل میں سے ادنیٰ درجہ کے وسائل ہیں خود خلافت نہیں۔ نیز یہ کہ وہ خواہ کچھ بھی ہوں مگر قرآن کی آیات بخون کا جن کو اس سلسلہ میں بطور ماخذ کے پیش کیا گیا ہے نہ مدلول ہیں نہ مصداق ہیں اور نہ کوئی تقاضا کردہ عمل ہیں۔ اُن کا ماخذ دوسری آیتیں ہیں جن میں اُن کی نوعیت اور حدود پر کافی و وافی روشنی ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا ہے کہ یہ مادی سامان مسلمان کے لئے میلان ترقی ہی نہیں کہ اُن میں گھس جانا اُس کی مدح و ذم، یا ایمان داری وغیرہ ایمان داری، یا لغطفی و معنوی کفر و اسلام کا معیار قرار پائے۔ مسلمان کے لئے معیارِ مدح و ذم صرف علم و اخلاق، تقرب روحانی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ مادی تقرفات بقدر ضرورت رکھے گئے ہیں۔ فی نفسہ مقصود و معیار نہیں۔

اسی سے حریت و آفاق کا مفہوم بھی اسلامی حیثیت سے مستحق ہو جاتا ہے کہ وہ صرف تلوار ہاتھ میں لے لینا نہیں بلکہ قانون حق کو نافذ العمل بنانا ہے پہلے اپنے اوپر پھر ماحول اور اُس کے پس و پیش پر اگر کسی قوم نے تلوار اٹھائے بغیر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کر لیا تو وہ بلاشبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے خواہ نفس کی ہو یا غیر کی۔ پیغمبر معصوم اور صحابہ کرامؓ مکہ کی ۱۳ سالہ زندگی

میں بھی آقا تھے جبکہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے جبکہ وسائل شوکت اُن کے ہاتھ میں تھے۔ کہتے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد و سیاست سمرے سے دیئے ہیں گئے۔ لیکن اِمامِ اربعہ کی تہذیب میں، خواہ وہ اخلاقی ہی رنگ میں ہو، دونوں کی آفاقی اور عند اللہ مقبولیت و عظمت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں جس سے واضح ہے کہ آفاقی حقیقت کوئی قدرِ مشترک ہے جو تلوار اور بے تلواری دونوں میں بدلتو قائم رہتی ہے اور وہ صرف دیانت، انابت اور اشاعت ہے اور جس کا حاصل اللہ کی غلامی ہے کہ اُسی میں آفاقی کا راز نہماں ہے۔

یہی دونوں حالتیں اُمت پر بھی گزرنی تھیں، اُمت کے بعض طبقے مگر کی زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں بلکہ ماریں کھا کر اعلائے کلمۃ اللہ کرنا اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دیئے جانا ہے جس کو قرآن نے جہاد و کبیر فرمایا ہے اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے، جس کا حاصل قوت سے استیصالِ فتنہ کر کے اشاعتِ دین کی راہیں ہموار کرنا اور شعائر اللہ کو اونچا بنانا ہے تاکہ دین حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے جس کو جہاد و صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں زندگیوں کا قدرِ مشترک وہی تین بدین اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ کلام اللہ اور تربیتِ خلق اللہ نکلتا ہے جو احوالِ مقصود ہے اور جو حقیقتِ ایمان کے کمال و نقصان، ہدایت و ضلالت، فُجور و تقویٰ اور غلات و عدمِ خلافت کا معیار ہے جن کی دُوسرے مسلمانوں کو پرکھا جاسکتا ہے۔

پس وَاعِظُوا لَهُمْ مَا اسْتَلَعْتُمْ مِیْ اٰیٰتِ کریمہ کے نام پر تیر و تفساگ

جمع کر لینا یا لگوین کی آیات سے بے عمل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلانے یا نفسِ خواہ کتنا ہی ضروری ہو مگر خود حریت و آفاقی نہیں۔ آفاقی قرآن کو نافذ العمل بنادینا ہے جس کے لئے یہ اعداءِ مستطاع ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زیادہ نہیں۔ جیسے وضو قرآن کی رُوس سے فرض و واجب سی مگر ہے ہر حال محض مفتاحِ صلوة، بلکہ وہ ضروری بھی اُسی کی وجہ سے ہے فی نفسہ نہیں۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی لیکن اُس کی شوکت دین کے حدود و شعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اُسے حریت و آفاقی کے دعویٰ یا تصور کا کوئی حق نہیں وہ بدلتو غلام ہے۔ دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی اور بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں اور اُس میں یہ فرق ہوگا کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک با تلوار لیکن نفسِ غلامی میں کوئی فرق نہ ہوگا بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ٹانگ و عار ثابت ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کے تلوار بدست مَنظُوق کی بے حرمتی یا بے توقیری کے دپے ہیں، معاذ اللہ! ہم اُن کے ہر حالت میں دعا گو ہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر اُن کی یہ شوکت اعلائے کلمۃ اللہ سے ہمارے نہیں بلکہ اور اُنہا اعلائے کلمۃ الکفر یا کلمۃ الفسق سے ہم آغوش ہے تو وہ ابھی تک نہ صرف وسائل بے مقصد ہی کے حال ہی میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ غلابِ مقصد رنگ و تازہ کرنے سے اُن کی یہ شوکت بھی کوئی اسلامی شوکت نہیں، اگر ہے تو کسی مدحِ محض قومی اور قوموں کے اشتراک کی وجہ سے خاص قومی بھی نہیں،

شوکت افنائے گناہ کے بجائے اضافہ گناہ کا ذریعہ ثابت ہوگی اور اس صورت میں اس گناہ و فاحشہ کی نسبت اُن ہی لوگوں کی طرف کی جائے گی جنہوں نے اضافہ گناہ کے اُن پر شوکت و سائل کو بنام اسباب افنائے گناہ اختیار کر لیا ہے کیونکہ جب انہوں نے ملزوم کو مان لیا ہے تو لازم کا ماننا لامحالہ اُن کے ہی سرچشمہ کا۔ خواہ اُن کا یہ ارادہ و نیت بھی نہ ہو۔

رہی حکومت و سلطنت تو اسباب معاش، صنائع و حرفت اور اسلحہ جنگ کی طرح وہ بھی وسیلہ قیام دین ہے، خود بخود یہ مقصود نہیں اور اگر خلافت مقصود کا ذریعہ ہو تو سخت مضر ہے۔ سلطنت کو مقصود اصلی پا کر کرانے اور ملکہ و مسلمانوں کو چوبہ قسمتی سے کہیں دوسری اقوام کے غلام بن گئے ہوں، غیر صالح یا غیر مومن، یا لفظی مومن اور عملی کافر پا کر کرانے کے لئے عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے :-

إِنَّ اللَّهَ يُمْرُؤُا يَرْثُهَا بِنَاءِ دِي الْقَائِلُونَ۔ "زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے" جس کا حاصل یہ نکال لیا گیا ہے کہ صالح افراد جو اپنی محنت و ایثار، تفسیر کائنات، تنظیم قبو و جہد اور جفاکشی وغیرہ سے سلطنت کا استحقاق پیدا کر لیں گے، زمین کے حاکم ان ہوں گے۔ لہذا جو حکمران ہیں وہ تو صالح ہیں خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں؟ اور جو حکمران نہیں ہیں وہ غیر صالح، لفظاً مومن اور عملاً کافر ہیں لیکن جبکہ یہ آیت اس بارے میں خاص نہیں تو اس سے کہیں کہ ملکہ و مسلمانوں کو ایمان کے بعد اس لئے فوقی سے یاد کیا جانا انتہائی جسارت اور قرآن کی تحریف ہے۔ کیونکہ :-

(۱) اول تو ان الارض کو ارض دنیا میں منحصر مان لینا ہی بے دلیل و دلیل ملکہ خلافت دلیل ہے۔ سلف میں سے ہجرت اس سے ارض جنت مراد لے رہے ہیں

بلکہ ایک نمائشی شوکت ہے۔

پس اس قسم کے منطقے تا تفصیل مقصد آفاقی کے تصور میں غلط و دائرہ دعوائے حریت میں غلط گواہیں۔ اسلام میں حریت و آفاقی تلوار کا نام نہیں تحقید علی قرآن کا نام ہے، جب وہ نہیں تو یہ وسائل اُس کے وسائل بھی نہیں اور اس لئے ایسے منطقے نہ مقصود کے حامل ہوتے ہیں نہ وسائل کے بلکہ اُن کی نسبت تو شاید وہی لوگ کچھ غنیمت ثابت ہوں گے جو کم از کم اعلائے کلمۃ اللہ، ترویج کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ کے مقصد کو علماً و عملاً منجملے ہوئے ہیں اور مابعد کے لئے جذبہ صادق سے قلوب کو خالی بھی نہیں پاتے۔

پس اگر ملکہ کی صبارانہ زندگی تبلیغی جہاد کی وجہ سے مجاہدانہ، اور وہ بھی بجا و کبیر زندگی کہلائی جاسکتی ہے تو ایسے افراد کی زندگی اس دو زمین میں کیوں اس پاک لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی؟ اور جو تلوار بدست ہو کر بھی اپنی عملی زندگی سے ان حقیقی مقاصد کی تکمیل کا ثبوت نہیں دیتے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُن کے مضر نظریات صرف دنیوی اقتدار اور جاہ و عیش و کم محدود دتے گو اُن کا زبانی دعویٰ کچھ بھی تھا۔ نیز ثابت ہو گا کہ وہ باقتدار تدین کو خلافت نہیں سمجھتے بلکہ صرف اقتدار ہی کو خلافت و ایمان سمجھتے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا اقتدار جس میں ملک اور دین تو اُن نہ ہوں بلکہ ملک بلادین ہو، وہ یقیناً خلافت نہیں ملوکیت ہے اور جبکہ وہ ملوکیت بھی تحفظ دین و شعار دین کا ذریعہ نہ بنے بلکہ اُس کے برعکس منافق دین امور کے تحفظ کا ذریعہ ہو تو وہ ملوکیت عاد و بھی نہیں بلکہ ملک عضوض ہے جسے کٹ کٹنا ملک کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ

اور ان کی وادفی باقرآن کہ ہے ہیں۔ چنانچہ سیاق و سباق کا تقاضا بھی یہی ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں صالح کو تحصیل سلطنت کی جدوجہد میں منحصر مان لینا غلط ہوگا کیونکہ جنت میں اُمتِ موحیہ اور اُنہم سابقہ کے وہ لائقہ و انسان بھی جائیں گے جنہیں سلطنت نہیں ملی، بلکہ ان کی شریعت ہی میں سلطنت نہیں رکھی گئی اور انہیں جہاد و سیاست کا مہرے سے محفلت ہی نہیں بنایا گیا۔ اندر میں صورت اس آیت سے محکوم مسلمانوں کو غیر صالح ٹھہرانا محض ایک جذباتی بات ہوگی۔

(۲) اور اگر ارض سے ارض دنیا ہی مراد ہو اور وراثت ایسی سے حکومت و سلطنت، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ساری زمین مراد لینا بھی بے دلیل ہوگا۔ جبکہ پورے دوسرے زمین پر مسلمانوں کی حکومت نہ آج ہے نہ قرنِ اولیٰ سے آج تک ہوئی۔ ورنہ تیرہ صدی کے تمام مسلمان حتیٰ کہ قرونِ اولیٰ کے بھی معاذ اللہ، غیر صالح اور علی کا فر ٹھہر جائیں گے، محکوم مسلمان بوجہ غلامی کے اور حکمران، امان بوجہ محدود السلطنت، ذہ جانے کے۔

(۳) اور اگر وراثت ارض سے کل ارض کی نہیں، بلکہ بعض ارض ہی کی حکومت مراد ہو تو جس صورت میں کہ یہ بعض غیر متین ہے، اس حکومت کے تحقق کے لئے کیفیتِ ما انتفی کسی خطہٴ زمین پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانا کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی غیر آزاد و خطوں کے محکوم مسلمان آیتِ بالائی رُوسے علی کا فر یا غیر صالح نہیں ٹھہرتے۔ البتہ اگر رُوسے زمین کے کسی خطہ پر بھی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو تو اس صورت میں معنی مذکور کی رُوسے سب گناہ کا ٹھہر میں گے۔ سو یہ صورت نہ آج ہے نہ گذشتہ

تیرہ صدی میں اب تک ہوئی۔

(۴) اور اگر وراثت ارض سے بعض متین خطوں کی حکومت مراد لی جائے جیسا کہ ملکِ شام اور فلسطین، چنانچہ بعض مفسرینِ سلف نے انہی طرف کے الف لام کو لامِ عہد کہہ کر اس سے فلسطین ہی مراد لیا ہے، تو یہ یہ آیت ایک مخصوص حکومت کی نشین گوئی ٹھہرتی ہے۔ جو دو صحابہ میں صالحین کے ہاتھوں پوری ہو گئی۔ اب اس آیت کی رُوسے کسی کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ وہ بعد کے مسلمانوں کو جو بدقسمت سے کہیں محکوم بن گئے ہوں غیر صالح یا علی کا فر قرار دے۔ اس صورت میں اسلامی حکومت کی ضرورت کا ماخذ بھی یہ آیت نہ ہوگی، اگر ہوگی تو یہ آیت ہو سکے گی:-

إِنَّ الْأَرْضَ فَسَدَتْ بِأُولَئِكَ النَّبَاتِ
يَشَاءُ مِنْ جَنَّا بَدَا بِهَا
اپنے بندوں میں سے بنا دے

مگر اس میں وراثت کے ساتھ صالح کی قید نہیں۔ اس کی رُوسے صالح اور غیر صالح دونوں حکمران بن سکتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ محکوم صالح بھی ہو سکتا ہے اور غیر صالح بھی، پھر محکوم کو غیر صالح اور علی کا فر کہہ دینا کس طرح جائز ہوگا۔

(۵) لیکن اگر اس آیت کو بلا تخصیص ساری ہی زمین کی حکومت پر معمولی کر لیا جائے اور صرف وہی لوگ صالح کے لقب کے مستحق ہوں جو حکومت بنائیں تب بھی اُس وقت یا کسی وقت کے بھی محکوم مسلمان یا محکوم اسلامی خطے، غیر صالح یا علی کا فر قرار نہیں دیئے جاسکتے کیونکہ اس آیت میں اُس ہفت اقلیم کی سلطنت کے لئے مسلمانوں کو کوئی میعاد نہیں دی گئی ہے کہ اس کے اندر اندر

اگر وہ آل ورلڈ عالمگیر حکومت بنالیں گے تو وہ صالح رہیں گے ورنہ غیر صالح،
اور علائقہ عربوں پر حکمرانی جائے گی، ورنہ سب سے پہلے تو یہ عدم صلاح کا الزام
معاذ اللہ قرن اولیٰ ہی کے سر پر چلائے گا۔ تاہم قرون مابعد چرمد؟
ہاں اگر صلاح کا مطلب یہ ہو کہ قوم میں عالمگیر حکومت قائم کر لینے کا جذبہ
اور ولولہ اور استعداد کی حد تک سچی و عمل ہو تو پھر قرن اولیٰ ہی نہیں سادے
باقی قرون مابعد جو اس دور حکومت سے قبل کے ہوں اس الزام سے بری ہو
جائیں گے۔ کیونکہ اسی حکومت جب بھی قائم ہوگی تو وہ درحقیقت اول سے
آخر تک کی پوری امت کے جذبات اور مساعیٰ ممکنہ کا نتیجہ ہوگی اور اس کی
تشکیل میں پوری ہی امت حصہ دار ہوگی۔ کیونکہ امت کے ایک ایک فرد کا ذہن
اور عقیدہ اس میں لڑا ہوا تھا اور ہر پہلے کی ذہنیت پچھلے کے لئے بنیاد بنتی
چلی آ رہی تھی۔ جو نبی ابتدائی اور درمیانی انکسار و اعمال کا لگاتار سلسلہ صدیوں
کے بعد اپنی انتہائی حد پر پہنچی اور اس مسلسل تبلیغ و عمل سے بالآخر دنیا
کی تمام قومیں اس ذہنیت پر انگلیں تو آخری نتیجہ عالمگیر حکومت کی صورت
میں نکل آ رہی ہیں۔ اس لئے حکومت کے ان درمیانی قرون و ادوار میں امت
کے کسی طبقہ کو بھی غیر صالح یا غیر مؤمن قرار نہیں دیا جائے گا جبکہ ہر طبقہ اس
حکومت کے بنانے میں اپنی اپنی بساط کی حد تک ذہنا و عملاً شریک رہا ورنہ
یہ آخری مطلوب نتیجہ اچانک برآمد کیسے ہو گیا۔ اگر انکسار و مساعیٰ کی ابتدائی اور
درمیانی کڑیاں اُسے برآمدگی کی حد پر نہیں لائی جاتیں؟
یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں حتیٰ کہ آج بھی کسی حکومت کی تشکیل کو

مزن نہ نہ تشکیل ہی کے افراد کی طرف منسوب نہیں کر دیتے۔ بلکہ آغاز تحریک سے
لے کر تمام تحریک تک کے تمام ہی افراد کی مساعیٰ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے
ایشیوں پر تمام کورسے ہوئے لیڈروں اور بانیان تحریک کا نام زندہ رکھا جاتا ہے
ہندوؤں میں اُن کے نام کے گیٹ بنائے جاتے ہیں۔ اُن کے فوٹو اور مجسمے سجائے
جاتے ہیں اور تقریر و تحریر میں عقیدت سے اُن کے تذکرہ کو زندہ رکھا جاتا ہے
بلکہ جس کے لوگوں کو (جن کے ہاتھ پر تحریک کی کامیابی ظاہر ہوتی ہے) اُن پہلے
ہی لوگوں کی کاوشوں کا مظہر مانا جاتا ہے۔

پس اگر اس آیت میں ورثہ ارض سے کل ارض مراد لے کر عالمگیر
حکومت ہی مراد لی جائے جو یقیناً اب تک قائم نہیں ہوئی تو حسب تصریحات
مفسرین اس سے لاشعار وہی عالمگیر حکومت مراد ہو سکتی ہے جو ظہور مہدیؑ اور
نور علی عسوی کے وقت اس دنیا کے آخری دور میں وقت کے نیا راہل اللہ کے
ہاتھوں تشکیل پائے گی، جس کے تحت پوری دنیا کا دین اور مسلک ایک ہو
جائے گا اور لیٹھار علی الدین علیہ السلام کا کھلا ظہور ہو جائے گا مگر جبکہ
یہ حکومت پوری امت کے ارتقاء کی جذبات و افکار کا ایک ظہور ہو گا اور
اُس میں قرن اولیٰ سے لے کر قرن آخر تک کے تمام مسلمان اپنے اپنے جذبات
اور ممکنہ اعمال سے شریک ہوں گے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت عام سے پہلے
کا کوئی طبقہ اور کوئی بھی محکوم علاقہ اس آیت کی دُوسرے غیر صالح اور علیٰ کافر
ہوگا؟ ورنہ اس آخری طبقہ کے علاوہ جس کے ہاتھ پر اس عالمگیر تشکیل کا ظہور
ہو سادے ہی طبقات امت معاذ اللہ غیر صالح اور غیر مؤمن تھے جائیں گے جس

کا تصور بھی ہمارے نزدیک انجمن خود میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ یہ آج کے مدعی بھی اپنی ہی زبان سے اپنی تکفیر سے بچ سکیں گے۔

(۶) پھر یہ کہ اگر آیت مذکورہ میں صالحین کا مفہوم استحقاق حکومت پیدا کرنے کی جدوجہد اور جانکاہی کے افعال میں گھس جانے ہی کا لیا جاتے اور اُس کی رو سے وہی لوگ صالحین کے مصداق ہوں جو اس سعی کے حامل ہوں ورنہ وہ عملاً کافر اور لفظی مؤمن رہ جائیں۔ تب بھی کلیۃً کوئی مسلمان طبقہ غیر صالح نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اس تفسیر پر جہاں آیت نے تشکیل حکومت کی جدوجہد کو صلاح کہا ہے وہاں اس جدوجہد کی کسی خاص نوعیت کی تخصیص اور تعین نہیں کی کہ وہ کیسی ہو؟ بلکہ مطلق چھوڑ دیا ہے، جس کے اطلاق کے نیچے فوجی سعی بھی آتی ہے کہ تشدد سے انقلاب کر دیا جائے۔ اقتصادی سعی بھی آتی ہے جیسے غاصب اقوام کا ہجرتی بائیکاٹ کر کے اول اقتصادی اور پھر سیاسی آزادی حاصل کر لی جائے۔ صنعتی اور تہذیبی سعی بھی آتی ہے، جیسے شہری اور ملکی ضروریات کی خود کفالت کر کے غاصبوں کی اقتصادی گرفت سے نجات حاصل کر لی جائے۔ عدم تشدد اور مقاومت مجہول کی سعی بھی آتی ہے، جس سے غاصب قوم کو معطل کر دیا جائے، آئینی اور پارلیمنٹری سعی بھی آتی ہے جس کے تحت الیکشنوں کے ذریعہ حکومت بدل دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

غرض صلاح کے معنی اگر تحصیل حکومت کی سعی ہی کے دکھ لئے جائیں تو ان میں سے وہ کون سی سعی ہے جو اس آیت کے عموم سے باہر رہ جائے گی؟ اور جبکہ ان میں سے کسی نہ کسی سعی کو حسبِ اقتضا مقام مسلمان اختیار رکھے ہوئے

ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں تو وہ کونسا استدلال ہے جس کی رو سے وہ غیر صالح یا علی کا فر کے جا سکے ہوں؟ کیونکہ یا تو وہ برسرِ اقتدار ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں یا پہلے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے کوئی نوع بھی صالحین کے مفہوم سے باہر نہیں ہوتی، جبکہ صلاح کے معنی اس سعی خاص ہی کے لئے جاوین تو پھر کچھ نہیں آتا کہ وہ غیر صالح اور علی کا فر کے نقطہ کے مسلمان ہیں جن کو مطعون کرنے کے لئے اس آیت کو بے عمل استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷) لیکن اگر غرض سے کام لیا جائے تو عرب زدگانِ تہذیب و سیاست کے لئے دین کے برعکاس اپنے سیاسی منصوبے پورا کرنے اور اس میں حائل شدہ طبقات کو غیر صالح کہہ کر راستہ سے ہٹانے کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں کیونکہ آیت میں وراثت یا حکومتِ الٰہی کے حصول پر بحث نہیں بلکہ استحقاق پر گفتگو ہے اور حاصل یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ کے نیک اور صالح بندے ہی اس وراثت کے مستحق ہوتے رہیں گے۔

یہ دوسری بات ہے کہ فساد و فحشاء اپنی چالاکوں سے انہیں برسرِ اقتدار نہ آنے دیں اور ان کی مساعی کو اپنی عیانہ نہ مساعی سے ناکام بنادیں لیکن اس سے اُن کے استحقاق میں فرق نہیں آ سکتا۔ جیسے نبی وراثت کے سلسلہ میں اگر اصل وارث کو غاصب لوگ محروم کر دیں جس کی وراثت پر قرآن نے اُسی طرح روٹی ڈالی ہے اور ہر ایک کا استحقاق حق تعالیٰ دیا ہے، تو یہ نہیں کہ اصل وارث، وراثت نہ رہے اور یہ متغلب اور غاصب وارث بن گئے۔

پس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حکومتِ الٰہی کے وارث اور مستحق حقیقاً علماء

واقعا وہ ہیں۔ اگرچہ کسی وجہ سے اس وراثت تک انہیں پہنچ نہ پایا جائے۔

نیز جب کہ ہر خبر میں کوئی نہ کوئی انشاء ضرور مخفی ہوتی ہے تو اس خبر کا کہ ”حقیقی وارثان اقتدار نیک بندے ہیں“ حاصل یہ نکلے گا کہ اقتدار کی باگ ڈور صلیا و انبیاء کے ہاتھ میں رکھو تاکہ وہ صلاح و عدل کے ساتھ حکومت چلا سکیں۔ اور نیک و تقویٰ کا دنیا میں دُور دورہ ہو جائے۔ آیت کے یہ لیے عام معنی ہیں کہ اس میں وہ تمام معانی داخل رہتے ہیں جو ابھی بیان کئے گئے اور کسی بھی دُور کے کسی مسلم طبقہ کو خواہ مخواہ غیر صالح یا عملی کا قربانے کا شوق بھی پُورا نہیں ہو سکتا۔

ہاں صالحین کا اقتدار سے محروم رہ جانا، کوئی عجوبہ نہیں۔ دُنیا میں ایسے اوقات بہت کم آئے ہیں کہ اقتدار کی گنجیاں حق پرستوں کے ہاتھ میں رہی ہوں عموماً دنیا پرست اُن کے مقابلہ میں ایسا کر کے ہر جائز و ناجائز طریق پر اقتدار غصب کرتے آئے ہیں جس کی مثالیں اُنہم سابقہ سے لے کر اُمتِ محمورہ کے اکثر قرون و دہور میں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس محروم الاقتداری کے باوجود شریعت نے انہیں صالحین ہی کہا ہے۔ غیر صالح یا غیر مومن نہیں بتایا۔

حضرت اُتمؓ سرمدی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں :-

إِذَا ظَلَمَ الْمَعَاصِي فَخُ امْتَنِي ”جب میری اُمت میں معاصی غاب ہو جائے
عَقَبَهُمُ اللّٰهُ جَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ“ ”پس تو اللہ اُن پر اپنا عذاب نازل کرے گا۔“

فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا يَصْبِغُهُمْ ”میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ان میں
آتَا سَتْ صَالِحُونَ؟“ ایک رنگ (صالحین) نہیں پھرتے؟

قَالَ يَصْبِغُهُمُ مَا صَابَ النَّاسُ ”فرمایا! ”نہیں! وہ عذاب پہنچا ہے جو عام
نعمہ یا عیدِ دولت الٰہی مغفرت“ لوگوں کو پہنچتا ہے۔ پھر آخرت میں وہ
مِنْ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا -“ مغفرت و درمنا کی طرف کر دیئے جاتے ہیں

یعنی اپنی نیکو برائی کا شر ہوگا، مگر یہاں
عام دُعا میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔“

(تفسیر ابن کثیر ص ۲۹۹ ۲۸۰)
اس عذاب عام کی تشفیں بھی بعض روایتوں میں فرمائی گئی ہے کہ وہ
غلائی ہے :-

لِيُؤْمَرَتْ عَلَيْهِمْ شُرَاكُهُمْ ”تم پر تمہارے میں سے بدترین لوگ حاکم
تَعْمِدُوا خِيَارَكُمْ فَلَا“ بنادے جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے کچھے
بَسَجِبْ لَكُمْ -“ لوگ دعا میں بھی مانگتے ہیں تو وہ قبول
رہیں کثیر ص ۲۹۹ ۲۸۰) نہیں کی جاتی :-

لیکن اس کے باوجود صالحین کو صالحین اور خیار کو خیار فرمایا گیا ہے، جس
سے واضح ہو گیا کہ غلائی کے باوجود صالحین کی صلاح میں کوئی فرق نہیں پڑتا
لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ صالحین اپنی صلاح پر غرہ کر کے آزادی اور
غلائی کا فرق اُٹھا دیں یا غلامی پر قناعت کر کے پیچھے رہیں یا صلاح کے علاوہ
باطن پر قناعت کر کے علاوہ ظاہر سے کنارہ کش ہو جائیں اور اُخْتَدَا اَزْ غَلَوَاتِ
کے ساعی اور طالبِ مذہب، شین بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ طعنہ زلوں کو ان

صالحین کے محکوم ہو جانے کے باوجود بھی انہیں غیر صالح یا غیر مومن کہنے کا کوئی حق نہیں۔

اور اگر یہ جہارتِ آیت وراثتِ ارض سے کی جا رہی ہے تو وہ بے محل ہے اور کسی جائز تفسیر پر مبنی نہیں۔ کیونکہ یہ استدلال دعویٰ عام اور دلیل خاص کا مصداق ہے۔

آیت کریمہ کے جب کہ اتنے محل ہیں اور اس کے عدم میں اتنی وسعت ہے کہ نہ ارض سے ارضِ دنیا ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ ارضِ دنیا مراد لے کر وراثت سے حکومتِ حالیہ ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ حکومتِ حالیہ سے کل زمین کی حکومت مراد لینا ہی ضروری ہے، نہ کل زمین کی حکومت مراد لے کر اُسے کسی مقررہ وقت میں حاصل کر لیا جانا ہی ضروری ہے، تو ایسے محمل اور کثیر المعنی استدلال سے اثنا بڑا دعوے جس سے یک لحظت کروڑوں مسلمان اور وہ بھی ہر دور کے مسلمان غیر صالح اور معنی لغتی مومن اور علی کافر قرار پا جائیں۔ آخر کس طرح ثابت ہو جائے گا اور کیسے جائز ہوگا؟ اور جب کہ آیت کا وہ جامع اور وسیع منہموم لیا جائے جس کے نیچے یہ تمام معانی آجائیں، یعنی استحقاقِ وراثت، عام اس سے کہ حصول ہو یا نہ ہو، تو پھر یہ تکفیرِ مسلمین کا دعوے ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے بحالتِ محکومی صالحین کا صلاح ذمائل تو کیا ہوتا، یہ آیت اس صلاح کے ثبوت کی دلیل بن جاتی ہے۔

بہر حال صالحین کا مادی طور پر گرفتہ محکومی ہو جانا مصیبتِ ضرور

ہے، لیکن مصیبت نہیں، کہ وہ تو بیک جنبشِ قلم غیر صالح بنا دیئے جائیں اور غاصبانِ اقتدار، فاسقِ معین ہوتے ہوئے بھی صالح رہیں۔

الحاصل ان عرض کردہ طور سے ان نظریات کی اصلیت کھل جاتی ہے جنہیں ”دوران“ کے انوکھے عنوان سے بطور ایجاد بندہ آیاتِ تکوین کا مدلول بتلا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کی دُوسرے مادی وسائلِ زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب و تحلیل سے کچھ اسبابِ عیش اور کچھ اسبابِ ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظِ دیگر اُن سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصدِ حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرایا گیا ہے اور پھر اُن پر قابو پالینے اور اُن کے ذریعہ کچھ دمی جاہ و اقتدار حاصل کر لینے ہی کا نام خلافت اور ایمان داری بتلایا گیا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ :-

(۱) آیاتِ تکوین کی دُوسرے صحیفہ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے لیکن معرفتِ صالح کے لئے نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے، لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلائے کلمۃ الفسق کے لئے۔

(۳) استخلاف فی ارض ضروری ہے، لیکن مادی خواج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے، نہ کہ دُور یا اسباب سے اپنی محتاجی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

قرآن تو ہر سے سے حذف ہو جائے اور علی قرآن باقی بھی رہے تو تبلیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذات نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اُموہ اور علی نمود اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبر وار خلاصہ سے یہ معنی نہیں رہت کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی، صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت و شوکت یا حسب ضرورت دنیا کے ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ انہیں آیات نیکوین کا مدلول کہے جانے، اُن کے معیار کفر و اسلام ہونے اور انہیں مقصد حیات کلمہ راہی ترقی کا میدان بنالینے یا غلو و افراط اور مبالغوں سے اُن میں منہمک اور فنا رہو جانے پر توجہ دینا ہے۔

کیونکہ ان امور کی مقصودیت کا حاصل مادیاتِ خالصہ ہے اور مادیات کا طبعی ثمرہ افراط عیش اور اس منفرط عیش کا حاصل طغیان و کشری ہے جو نتیجتاً حق سے بغاوت ہے اور تیاری آخرت اور اعلائے کلمہ اللہ میں حادج ہے جس کا دوسرا نام فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ضد ہے۔

اور کون نہیں جانتا کہ اس ضد خلافت کو خلافت کہنا بلاشبہ تبلیس حق باطل اور کتمان حق ہے۔ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكَلَّمُوا الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

ان حقائق کے اصولی طور پر واضح ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں رہتی

(۴) مذہب اور تمدن اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں۔ لیکن تعاون باہمی میں اندیاد کے لئے، نہ کہ مادیات میں غلو اور فنا فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق ہم پہنچانے اور صورتوں کے واسطے سے حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ویزانوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تخریب کے لئے امکانی تیاری (اعداؤ مستغاث) ضروری ہے، لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عذر و عذر پر کلیتہً اعتماد کے ساتھ نہیں، بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوت قلب و حوصلہ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، نیکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الہی اور قرب حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور ارضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جب کہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تقنین طبع اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو تین قرآن کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ ربانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ کی ذات اقدس علی قرآن ہو، نہ کہ دو قرآن کے نظریہ کے ساتھ، جس میں سے تمثیلی

کہ ”دوران“ کے ہر ہر جزئیہ کے بارے میں علیحدہ علیحدہ کچھ کہا جائے جبکہ اصل نظریہ کے بارے میں اصولی تنقید اور تحقیق سامنے آگئی جو ان جزئیات کی روح اور قدر مشترک ہے جس سے تمام جزئیات کا خود ہی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع بھی جزئیات میں کلام کرنا نہ تھا، بلکہ نظریات کی مہمک اصولی معروضات پیش کرنا تھا، جو ضرورت کی حد تک پیش کر دی گئیں۔

فَإِنْ يَأْكُ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ وَإِنْ يَأْكُ خَطَا فَمِنْ
وَمِنْ الشَّيْطَانِ. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ
الْعَظِيمِ۔ وَ بِاللَّهِ التَّوْفِيقُ ۝

الفوز الكبير

أصول التفسير

اصول تفسیر پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب

تفسیر کے چند ضروری اصول

کے عنوان سے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نظام کا جدید علمی مقالہ

احقر

محمد طیب غفرلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند



586